درس ۱۸

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

انقلابِ نبوی ؐ کا اساسی منہاج

سورۃ الجمعہ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

انقلابِ نبوی ﷺ کا اساسی منہاج

سورۃ الجمعہ کی روشنی میں

مدرس

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون:03-5869501

نام کتاب ———— انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

بارِ اوّل (نومبر ۲۰۰۲ء) ———— ۲۲۰۰

ناشر ———— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

مقام اشاعت ———— ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ———— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ———— ۱۵ روپے

درس ۱۸

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بنیادی طریق کار

یا

انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج

سورۃ الجمعہ کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

سورۃ الجمعہ کے مضامین پر غور و فکر کے ضمن میں بھی ہم وہی طریق کار اختیار کریں گے جو سورۃ الصف کے ذیل میں اختیار کیا گیا تھا کہ پہلے سورت کی مرکزی آیت کو کماحقہ سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے بعد ایک ایک آیت کو غور و فکر کا موضوع بنایا جائے۔ بالخصوص ہر آیت کا جو ربط و تعلق اس مرکزی آیت کے ساتھ بنتا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کے مضامین کا باہمی ربط

یہ بات اس سے پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ میں جوڑے جوڑے ہونے کی وہ نسبت جو قرآن مجید کی اکثر سورتوں میں موجود ہے' بہت ہی نمایاں ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں بلند پایہ سورتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے دو پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں۔ چنانچہ سورۃ الصف کا مرکزی مضمون تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت' جبکہ سورۃ الجمعہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس مقصد بعثت کے حصول اور اس عظیم مشن کی تکمیل کے لئے آپ کا بنیادی طریق کار کون سا تھا! ـــــ یہاں لفظ "بنیادی" خاص

طور پر قابل توجہ ہے اور اسے سمجھنے کے لئے ہمیں قدرے تفصیل میں جانا ہو گا۔

اگرچہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اگر ہم عام مروجہ معنوں میں نبی اکرم ﷺ کو ایک انقلابی رہنما کہیں تو یہ یقیناً آپؐ کی توہین کے مترادف ہو گا' لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ داعیِ انقلاب کا اطلاق نسلِ انسانی کے کسی فرد پر اگر بتمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں!! اس لئے کہ تاریخ انسانی کا ہمہ گیر ترین اور گھمبیر ترین انقلاب برپا کرنے کا سہرا بلاشبہ آپؐ ہی کے سر ہے۔

تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب

غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ تاریخ کے دو بڑے بڑے انقلاب جن کا بہت شہرہ ہے' محض جزوی انقلابات تھے۔ انقلابِ فرانس ہو یا انقلابِ روس' ان دونوں نے زندگی کے رخ میں کوئی ہمہ گیر تبدیلی برپا نہیں کی۔ انقلابِ فرانس میں لوگوں کے افکار اور عقائد نہیں بدلے' ان کا طرزِ معاشرت تبدیل نہیں ہوا' صرف نظامِ حکومت کا ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ یعنی شخصی حکومت کا دور ختم ہوا اور جمہوریت کا آغاز ہو گیا۔ اسی طرح انقلابِ روس (Bolshevik Revolution) اگرچہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا' بلکہ اگر اسے انقلابوں کی ماں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ اس کی کوکھ سے انقلابوں کی ایک پوری کھیپ برآمد ہوئی ہے' بایں ہمہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کے ذریعے بھی ایک جزوی تبدیلی ہی آسکی' یعنی محض نظامِ معیشت کا ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ اور ویسے تو کہا جا سکتا ہے کہ ایک بڑا انقلابی فکر یعنی جدلی مادیت (Dialectical Materialism) اس انقلاب کی پشت پر تھا لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو مادیت پہلے سے موجود تھی' اس نے صرف ایک قدم آگے بڑھایا اور جدلی مادیت کی شکل اختیار کر لی' اسے آپ "مادیت" سے "جدلی مادیت" تک ایک ارتقائی عمل تو کہہ سکتے ہیں' انقلابی عمل نہیں کہہ سکتے۔ گویا کہ وہاں بھی اصل تبدیلی زندگی کے محض ایک گوشے یعنی نظامِ معیشت میں واقع ہوئی کہ کوشش کی گئی کہ ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لے کر حصہ رسدی تمام افراد تک کسی قدر منصفانہ انداز میں پہنچا دیا جائے۔ اس سے قطع نظر کہ معاشی ڈھانچے میں اس تبدیلی کے ضمن میں

انسان کو کیا قیمت ادا کرنی پڑی اور اس کا کیا ردِ عمل سامنے آرہا ہے' فی الوقت صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ دنیا کے یہ تمام انقلابات جزوی تھے' جبکہ نبی اکرم ﷺ کا لایا ہوا انقلاب ہمہ گیر تھا۔ اس انقلاب میں لوگوں کے عقائد بدلے' افکار بدلے' نظریات بدلے' زندگی کی قدریں بدلیں' نقطۂ نظر تبدیل ہوگیا' سوچ کا رُخ بدل گیا' طرزِ بود و باش بدل گئی' معیشت کا انداز بدل گیا' سیاست کے طور اطوار بدل گئے' یوں کہئے کہ زمین بدل گئی' آسمان بدل گیا۔ بلکہ یہاں یہ تلاش کرنا پڑتا ہے کہ کیا چیز نہیں بدلی! ــــــ اس پہلو سے کسی دوسرے انقلاب کو انقلابِ محمدیؐ سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہو سکتی! چنانچہ اس پہلو سے ہمارے اس دور کے برعظیم پاک و ہند کے ایک بہت بڑے انقلابی ایم این رائے نے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اپنی مشہور کتاب "Historical Role of Islam" میں اگر یہ کہا کہ محمد ﷺ بہت بڑے انقلابی رہنما تھے تو واقعہ یہ ہے کہ غلط نہیں کہا۔

دوسری طرف یہ پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ دنیا کے تمام اہم انقلابات کا اگر مشاہدہ کیا جائے تو ایک بات قریباً ہر جگہ مشترک نظر آئے گی کہ انقلابی فکر تخلیق کرنے والے یا پیش کرنے والے کچھ اور لوگ تھے اور اس انقلاب کو عملاً برپا کرنے کا معاملہ کچھ اور لوگوں کے ہاتھوں ہوا۔ انقلابِ فرانس کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ والٹیر' روسو اور ان جیسے نامعلوم کتنے اہلِ قلم تھے جنہوں نے وہ فکر دیا کہ جس کی بنیاد پر اس انقلابی عمل کا آغاز ہوا۔ لیکن یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ انقلابِ فرانس کے عملاً برپا ہونے اور اس کی عملی رہنمائی میں ان مفکرین کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ وہ انقلاب عملاً کچھ اوباش قسم کے لوگوں کی رہنمائی میں برپا ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بڑا ہی خونی انقلاب تھا۔ اسی طرح کا معاملہ انقلابِ روس (Bolshevik Revolution) کا بھی تھا۔ اس انقلاب کے لئے انقلابی فکر دینے والا کارل مارکس جو جرمنی کا رہنے والا تھا' خود اپنی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہیں کر سکا۔ سوچئے' یہاں ایک بالکل ہی دور دراز کے ملک میں ایک فعال شخصیت لینن کے ہاتھوں وہ انقلاب برپا ہوا جس نے کارل مارکس کے دیئے ہوئے فکر و فلسفہ کو دنیا میں ایک انقلاب کی عملی شکل میں ڈھالا۔ معلوم ہوا کہ انقلابی فکر

دینے والے بالعموم کچھ اور لوگ ہوتے ہیں اور انقلاب برپا کرنے والے کوئی اور!

اس پس منظر میں دیکھئے تو نبی اکرم ﷺ کا معاملہ منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے۔ ایک فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور کل تیئس برس میں یعنی ایک "life span" کے اندر اندر انقلاب کی تکمیل ہو گئی۔ بلکہ یہ تیئس برس بھی شمسی نہیں قمری ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہمارے حساب سے وہ بمشکل بائیس برس بنتے ہیں۔ کل بائیس برس میں ایک شخص فردِ واحد کی حیثیت سے دعوت کا آغاز کرتا ہے اور پھر وہ دعوتی و انقلابی جدوجہد ان تمام مراحل کو طے کر کے جو کسی بھی انقلاب کو درپیش ہوتے ہیں' نہایت خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ اس میں آپ ﷺ کو تمسخر و استہزاء کے ابتدائی مرحلے سے گزرنا پڑا' پھر وہ شدید تشدد (persecution) کا دور بھی آیا جس میں اہل ایمان پر وحشیانہ مظالم ڈھائے گئے' پھر وہ مرحلہ بھی آیا کہ وطن کو چھوڑنا پڑا' مکے کی سرزمین کو خیرباد کہہ کر مدینہ منورہ کا رخ اختیار کرنا پڑا' پھر اقدام کا مرحلہ بھی آیا اور جہاد و قتال کے مراحل سے بھی گزرنا پڑا۔ اور اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے تمام مراحل سے گزر کر کل تیئس برس کی مدت میں وہ انقلاب اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ جس کی طرف توجہ دلانے کے لئے یہ ساری بات گوش گزار کی گئی' یہ نکلا کہ حضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں اس انقلابی عمل کے مختلف مراحل بہت نمایاں ہو گئے۔ بلکہ آپؐ کے اس انقلابی عمل کا tempo اتنا شدید ہے اور وہ انسان کی توجہ کو اس درجے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کہ اس انقلابی عمل کی پشت پر کارفرما اساسی طریق کار بالعموم نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اساسی طریق کار یا منہج عمل اپنی جگہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ اس انقلابی جدوجہد' اس تصادم اور اس تمام تر جہاد و قتال کے لئے وہ افراد کس طور سے حاصل ہوئے کہ جن میں ہر ایک عزم و ہمت اور استقامت کی چٹان ثابت ہوا۔ ان افراد کے فکر و نظر میں انقلاب کیونکر برپا ہوا اور پھر ان کی تربیت کا معاملہ کس نہج پر رہا! گویا غور طلب بات یہ ہے کہ اس انقلابی عمل کی تہہ میں کارفرما وہ کون سا عمل تھا کہ جس کے ذریعے انفرادی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا۔ جس طرح کسی پہاڑی ندی کا زور و شور اور اس کی موجوں کا تلاطم انسان کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کہ اس کی گہرائی

کی طرف توجہ نہیں ہوتی' اسی طرح نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا یہ پہلو یعنی انقلابی کشمکش اور اس میں تصادم کے مختلف مراحل کسی بھی سیرت کے سننے یا پڑھنے والے کو اس درجے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں کہ اس جدوجہد کے پس پشت کار فرما اساسی منہاج اور بنیادی طریق کار نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور ساری توجہ اسی ایک پہلو پر مرتکز ہو جاتی ہے۔

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

سورۃ الجمعہ میں درحقیقت نبی اکرم ﷺ کے اسی اساسی منہاج اور بنیادی طریق کار کو واضح کیا گیا ہے جس کے ذریعے وہ افراد تیار کئے گئے کہ جو اس انقلابی جدوجہد میں نبی اکرم ﷺ کے دست و بازو بنے اور جن کے اندر کا انقلاب بیرونی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا۔ اس مضمون کی اہمیت کو اکبر الٰہ آبادی کے ایک شعر کے حوالے سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے' بڑا پیارا شعر ہے ؎

خدا کے کام دیکھو' بعد کیا ہے اور کیا پہلے!
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

کہ اگرچہ حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں غزوۂ بدر' غزوۂ اُحد' غزوۂ احزاب' صلح حدیبیہ اور فتح مکہ بڑے اہم نشاناتِ راہ (land marks) شمار ہوتے ہیں لیکن اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ وہ بنیادی process اور طریق کار کون سا تھا کہ جس سے انقلاب کی داغ بیل پڑی' جس سے افراد کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا' وہ افراد کہ جنہوں نے اپنی سیرت و کردار سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا نقشہ وہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں بایں طور آیا ہے کہ :

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ ﴾

"اہل ایمان میں ایسے جوان مرد موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچا کر دکھایا۔"

﴿ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ ﴾

"تو ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے (اور گردنیں کٹوا کر سبکدوش

ہو چکے' سرخرو ہو چکے) اور باقی ابھی منتظر ہیں (کہ کب ہماری باری آئے اور ہم بھی سبکدوش ہو جائیں اور) انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔

وہ مردانِ کار کس process سے اور کس طور سے تیار ہوئے تھے' یہ ہے درحقیقت سورۃ جمعہ کا مرکزی مضمون۔

سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت

سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت (یعنی آیت نمبر ۲) کے بارے میں پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس میں جو چار اصطلاحات وارد ہوئی ہیں' ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں چار مقامات پر ان کا اعادہ کیا گیا ہے اور یہ ایک نہایت غیر معمولی بات ہے۔ سب سے پہلے سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دعا میں وہ الفاظ آئے' پھر چند رکوعوں کے بعد اللہ کی طرف سے اس دعا کی قبولیت کے اعلان کے ذکر میں انہی الفاظ کا اعادہ ہوا' پھر سورۂ آل عمران میں اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے بیان میں کہ اللہ نے تم میں اپنا ایک رسول بھیج دیا ہے پھر انہی چار اصطلاحات کو دہرایا گیا اور پھر آخری مرتبہ یہ چاروں اصطلاحات یہاں سورۃ الجمعہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اور یہاں تو یہ الفاظ یا یہ اصطلاحات گویا کہ اس پوری سورت کے لئے بمنزلۂ عمود ہیں' یا یوں کہہ لیجئے کہ انہیں اس سورت کے مرکزی مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے آیئے کہ اس سورۂ مبارکہ پر اور بالخصوص اس کی آیت نمبر ۲ پر نگاہوں کو پورے طور پر مرتکز کر دیا جائے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ ﴾

دیکھئے! جس طرح سورۃ الصف کی مرکزی آیت کا آغاز ہوا تھا ﴿ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ ﴾ کے الفاظ سے' اسی طرح سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت کا آغاز ہو رہا ہے ﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ کے الفاظِ مبارکہ سے۔ دونوں مقامات پر ایک ہی اسلوب ہے اور نہایت ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ ﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾

"وہی اللہ ہے جس نے اٹھایا اُمیین میں ایک رسول انہی میں سے"۔ بعث کے معنی ہیں کسی چیز کا اٹھانا یا برپا کرنا۔ چنانچہ "بعث بعد الموت" کی اصطلاح موت کے بعد جی اٹھنے کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ لفظ "اُمیین" پر ہم ان شاء اللہ بعد میں گفتگو کریں گے کہ یہ اس سورۂ مبارکہ کے اہم مضامین میں سے ہے۔ ابھی ذرا وقتی طور پر اس لفظ سے توجہ کو ہٹاتے ہوتے آگے بڑھئے۔ اگلے الفاظ اس اعتبار سے نہایت اہم ہیں کہ ان میں رسول کے طریق کار یا منہج عمل کا بیان ہے کہ وہ رسول جو اللہ نے مبعوث فرمایا ہے کیا کرتے ہوئے آیا ہے : ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ "تلاوت کرتا ہے ان لوگوں پر اس کی آیات (یعنی اللہ کی آیات) اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی"۔ آیت کا آخری ٹکڑا حسب ذیل ہے : ﴿ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ "اور اگرچہ وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے"۔

چار اہم اصطلاحات

یہ ہے وہ آیۂ مبارکہ جس کے بارے میں عرض کیا گیا ہے کہ یہ مضمون کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے۔ اس میں چار اصطلاحات وارد ہوئی ہیں : i) تلاوتِ آیات' ii) تزکیہ' iii) تعلیم کتاب' اور iv) تعلیم حکمت۔ ان چاروں پر آپ غور کریں گے تو پہلی بات نمایاں ہو کر آپ کے سامنے یہ آئے گی کہ ان چار میں سے کم از کم دو کے بارے میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ ان سے مراد سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں! ظاہر بات ہے کہ تلاوتِ آیات سے مراد قرآن مجید کی آیات ہی کا پڑھ کر سنانا ہے۔ اسی طرح تعلیم کتاب سے مراد بھی قرآن حکیم ہی کی تعلیم ہے۔ البتہ دو اصطلاحات وہ ہیں کہ جن کے بارے میں کچھ ظاہر بین لوگوں کو یہ اشتباہ لاحق ہو سکتا ہے کہ شاید ان سے کتاب اللہ کے سوا کوئی اور شے مراد ہے۔ چنانچہ عمل تزکیہ کے بارے میں ایک گمان یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا اپنا علیحدہ تشخص ہے۔ اسی طرح لفظ "حکمت" کے بارے میں بھی ہمارے ہاں ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا اور بعض بڑے

بڑے ائمہ دین کی طرف سے‘ جن میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں‘ یہ خیال سامنے آیا ہے کہ اس سے مراد سُنّتِ رسولؐ ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے تمام تر احترام کے باوصف یہاں ہمیں یہ غور کرنا ہوگا کہ ان چاروں اصطلاحات کا باہمی ربط و تعلق کیا ہے اور خود قرآن حکیم کے دوسرے مقامات سے ان کا کیا مفہوم متعین ہوتا ہے۔ جس طرح سورۃ العصر کے بارے میں عرض کیا گیا ہے کہ شرائط نجات کے بیان میں وہ چاروں چیزیں جو وہاں بیان ہوئی ہیں ان میں باہم بڑا گہرا معنوی ربط موجود ہے۔ ایمان حقیقی کا لازمی نتیجہ عمل صالح ہے۔ اور عمل صالح اگر پختگی کو پہنچے گا تو اس سے تواصی بالحق کے برگ و بار لازماً ظاہر ہو کر رہیں گے۔ اسی طرح اگر صحیح معنی میں حق کی دعوت دی جائے تو یقیناً صبر کا مرحلہ آکر رہے گا‘ تکالیف و مشکلات آئیں گی اور انہیں جھیلنا ہوگا۔ تو جس طرح سورۃ العصر کی ان چار اصطلاحات میں باہم گہرا ربط ہے‘ اسی طرح سورۃ الجمعہ کی متذکرہ بالا چار اصطلاحات بھی باہم مربوط ہیں۔

تزکیے کے بارے میں تفصیلی گفتگو تو بعد میں ہوگی‘ سردست اتنی بات نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید مدعی ہے کہ تزکیہ کا اصل ذریعہ وہ خود ہے۔ سورۂ یونس میں صاف الفاظ میں فرمادیا گیا: ﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ﴾ یعنی ”اے لوگو! تمہارے پاس آچکی ہے تمہارے رب کی طرف سے ایک موعظت‘ ایک نصیحت جو شفا ہے تمہارے سینوں کے امراض کے لئے“۔ یہ قرآن تمہارے تمام باطنی اور روحانی امراض کا مداوا بن کر نازل ہوا ہے۔ تزکیۂ نفس یا تزکیۂ باطن کا اصل ذریعہ خود قرآن ہے۔ اور جہاں تک ”تعلیم حکمت“ کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۂ بنی اسرائیل میں وہ آیت وارد ہو چکی ہے جو اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے کہ حکمت کا اصل سرچشمہ بھی خود قرآن ہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ﴾ ”یہ ہے وہ چیز کہ (اے محمد ﷺ) آپ پر وحی کی ہے آپ کے رب نے از قسم حکمت!“ تو معلوم ہوا کہ یہ چاروں اصطلاحات یعنی تلاوتِ آیات‘ تزکیہ‘ تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت در حقیقت قرآن مجید ہی کے گرد گھوم رہی ہیں اور ان سب کا مرکز و محور قرآن مجید ہی ہے۔ گویا بالفاظِ دیگر محمد

رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب یہی قرآن مجید ہے' جس کے بارے میں مولانا حالی نے بڑے پیارے انداز میں کہا تھا ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

غور کیجئے' محمد رسول اللہ ﷺ نے افراد کی زندگیوں میں وہ عظیم انقلاب کیسے برپا فرمایا! ان کے فکر اور ان کے کردار میں جو ہمہ گیر تبدیلی آئی وہ کیونکر آئی؟ اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس تمام تبدیلی کی بنیاد اور اساس خود قرآن حکیم ہے۔ تو آیئے کہ ہم ان چار اصطلاحات پر اپنی توجہات کو مرکوز کریں!

تلاوتِ آیات

نبی کریم ﷺ کا پہلا کام یا آپ کے فرائض چہار گانہ میں سے پہلا فریضہ ہے تلاوتِ آیات' جس کے لئے یہاں الفاظ لائے گئے : ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ —— "تَلَا' يَتْلُوْ" اگر بغیر کسی صلے کے آئے تو اس کے معنی خود پڑھنے کے ہوتے ہیں اور جب اس پر "علٰی" کا اضافہ ہو جائے' جیسے تَلَا عَلَيْهِ تو اس کے معنی ہوں گے کسی کو پڑھ کر سنانا۔ کارِ نبوت یا کارِ رسالت کا سر آغاز یہی تلاوتِ آیات ہے۔ دعوت کا آغاز تلاوتِ آیات ہی سے ہوتا ہے۔

لفظ آیات پر اس سے قبل ہمارے ان اسباق میں گفتگو ہو چکی ہے۔ غور کیجئے کہ آیات یا نشانیوں کا حاصل کیا ہے! ہم پڑھ چکے ہیں کہ ان آیات سے اصل مقصود ذہن کو اللہ کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ اللہ کی یاد دلوں میں تازہ ہو جائے' اللہ کی معرفت اور اس پر ایمان قلوب میں اجاگر ہو جائے۔ یہی آیات ہیں کہ جو پھر انسان کو بعث بعد الموت کی طرف اور جزا و سزا کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ گویا ہر اعتبار سے اولین کام تلاوتِ آیات ہی بنتا ہے۔ قرآن مجید کی حکمت نزولی سے ہمیں اس کی مزید تائید ملتی ہے کہ قرآن مجید میں مکی سورتوں میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان سب کا بنیادی موضوع ایک ہی ہے اور وہ ہے توحید' کہ اصل مقصود یہ ہے کہ ایمان باللہ دلوں میں جاگزیں ہو جائے' ہستی باری

تعالیٰ کا یقین راسخ ہو جائے' اس کی صفاتِ کمال کا علم حاصل ہو جائے' اس کی توحید پر دل ٹھک جائے' جزا و سزا' بعث بعد الموت' حشر نشر اور جنت و دوزخ پر ایک یقین محکم پیدا ہو جائے' نبوت و رسالت اور انزالِ وحی و کتب کے ضمن میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ یہ ہے اصل اہمیت کی چیز' یہ ہے کارِ رسالت کا نقطہ آغاز!

قرآن حکیم کی آیات نے آکر لوگوں کے ذہنوں سے تمام ملحدانہ خیالات' مشرکانہ عقائد اور اس کائنات اور خود اپنے بارے میں انسان کے قائم کردہ تمام غلط نظریات کو دھو دیا اور صاف کر دیا۔ اس تطہیر ذہنی و فکری کا اصل ذریعہ ہے تلاوتِ آیات!

ایک فرد کے معاملے کو ذہن میں رکھ کر آپ اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایک فرد میں اسلامی انقلاب آجائے تو ظاہر بات ہے کہ آپ کو سب سے پہلے اس کی سوچ اور اس کے نقطۂ نظر کا جائزہ لینا ہوگا اور اس کے فکر کی اصلاح سے کام کا آغاز کرنا ہوگا۔ اگر آپ چھوٹتے ہی اسے کچھ شعائرِ اسلامی کا احترام کرنے یا نماز روزے کی تلقین کریں گے تو یہ ایک غیر حکیمانہ ترتیب ہوگی۔ آپ کو سب سے پہلے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ اُس شخص کا فکر کیا ہے' اس کی سوچ کیا ہے' آیا وہ اس کائنات کو محض ایک حادثہ سمجھتا ہے اور اس کا یہ خیال ہے کہ یہ نظام از خود چل رہا ہے یا وہ مانتا ہے کہ اس کا کوئی خالق' مالک اور مدبر بھی ہے!! اسی طرح یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ اسی دُنیوی زندگی کو کل زندگی سمجھتا ہے یا حیاتِ بعد موت کا کوئی تصور اس کے ذہن میں موجود ہے! ــــــ اور آیا وہ صرف عقل اور حواس ہی کو اپنے لئے حصولِ علم کا ذریعہ اور ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ سمجھتا ہے یا یہ کہ وہ کسی ماوراء عقل یا ماوراء حواس ذریعہ علم (source of knowledge) کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہے؟ اگر آپ کی اس انقلابی کوشش کا آغاز یہاں سے نہیں ہوگا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی کوششیں بار آور نہیں ہوں گی۔ اگر ذہن پر مادہ پرستی' الحاد اور مختلف مشرکانہ اوہام کا تسلط ہے تو سب سے پہلے ان کی تطہیر لازم ٹھہرے گی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جس ماحول میں وہ انقلاب برپا فرمایا اس میں تلاوتِ آیات کے ذریعے لوگوں کی ذہنی اور فکری تطہیر کے عمل کو مقدم رکھا۔ مادہ

پرستی‘ الحاد اور مشرکانہ اوہام کے زہر سے قلوب و اذہان کو پاک کر کے مثبت طور پر دلوں میں ایمان باللہ‘ ایمان بالآخرت اور ایمان بالوحی اور رسالت کی بنیادیں قائم کیں۔ یہ ہے درحقیقت انقلابِ محمد ﷺ کا نقطہ آغاز۔ یہاں سے بات آگے چلتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ دعوت و تبلیغ کے بارے میں جتنی اصطلاحات بھی وارد ہوئی ہیں ان سب کا مبنیٰ‘ ان سب کا مرکز اور محور قرآن مجید خود اپنے آپ کو قرار دیتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے ضمن میں "انذار و تبشیر" انبیاء کرام کا ایک بنیادی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ انذار کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ﴾ (الانعام : ۱۹) "مجھ پر یہ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اس کے ذریعے سے خبردار کردوں"۔ معلوم ہوا کہ انذار کا اصل ذریعہ خود قرآن حکیم ہے۔ اسی طرح تبشیر کے بارے میں فرمایا: ﴿فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا۝﴾ (مریم : ۹۷) "(اے نبیؐ!) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا ہے‘ تاکہ آپ اسی کے ذریعے اہلِ تقویٰ کو بشارت دیجئے اور اسی کے ذریعے آپ انذار فرمائیے اور خبردار کیجئے جھگڑالو قوم کو"۔ گویا انذار ہو یا تبشیر دونوں کا ذریعہ اور مرکز و محور خود قرآن ہے۔

اسی طرح انبیاء کا ایک فریضہ "تذکیر" بھی ہے۔ یعنی یاد دہانی کرانا‘ نصیحت کرنا۔ سورۂ قٓ کی آخری آیت میں اس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ﴾ "تذکیر فرمائیے اس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہو"۔ اسی طرح فرائض نبوت و رسالت کی تعبیر کے ضمن میں ایک اہم اصطلاح "تبلیغ" کی ہے۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ "(اے نبیؐ) پہنچا دیجئے‘ تبلیغ فرمائیے اُس کی جو نازل کیا گیا آپ پر آپ کے رب کی طرف سے"۔ الغرض دعوت و تبلیغ کے ضمن میں قرآن حکیم کی جو بھی بنیادی اصطلاحات ہیں مثلاً انذار و تبشیر اور تذکیر و تبلیغ‘ ان سب کا مرکز و محور خود قرآن ہے۔ چنانچہ سیرتِ مطہرہ میں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ آپؐ نے ہر جگہ قرآن ہی کو پیش کیا‘ اپنی بات کہنے اور اپنی تقریر کرنے سے حتی الامکان احتراز فرمایا۔ بعض لوگوں نے خطباتِ نبویؐ کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی قلیل تعداد میں خطبات دستیاب ہو سکے

ہیں۔ آپؐ کی گفتگو نہایت جامع اور مختصر ہوتی تھی اور جس جگہ بھی آپؐ دعوت پہنچانے کے لئے تشریف لے جاتے قرآنی آیات لوگوں کو پڑھ کر سناتے اور ان کے ذریعے انذار' تبشیر اور تذکیر فرمایا کرتے تھے کہ یہ ایک کلام ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ یہ ایک پیغام ہے جس کو لے کر میں آیا ہوں۔ اسی قرآن کے ذریعے سے آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ تو گویا انقلابِ محمدیؐ کا نقطۂ آغاز ہے تلاوتِ آیات اور اس کے ذریعے انذار و تبشیر' تذکیر و نصیحت اور دعوت و تبلیغ!

تزکیہ

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ کے بعد اب آگے چلئے! ﴿ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾ - یہ وہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں بدقسمتی سے ہمارے ہاں سب سے زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور یہ خیال عام ہے کہ قرآن مجید نے شاید تزکیہ نفس کا کوئی طریقہ ہمیں عطا نہیں فرمایا! بلاشبہ یہ بہت بڑا سوئے ظن ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کے طرزِ عمل سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سوئے ظن میں مبتلا ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے تزکیہ نفس کا کوئی طریقہ ہمیں عطا نہیں فرمایا۔ میں پھر عرض کروں گا کہ یہ بہت بڑا سوئے ظن ہے قرآن حکیم سے بھی اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے بھی۔

تزکیے کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس مرحلے پر اسے اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ نوٹ کیجئے کہ تزکیہ کرنا انسان کا مطلوب ہے اور انسان مجموعہ ہے دو چیزوں کا۔ ایک ہے اس کی فکر اور اس کی سوچ اور دوسری چیز ہے اس کا عمل اور اس کی روش یا اس کا وہ طرزِ عمل جو وہ زندگی میں اختیار کرتا ہے۔ کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں جن کے فکر و عمل میں بُعد یا تضاد پایا جاتا ہے۔ ایسے شخص کو آپ ایک مریض شخصیت قرار دیتے ہیں' اسے نارمل انسان نہیں قرار دیا جاتا' ورنہ ایک نارمل انسان ایک ناقابل تقسیم اکائی (integrated whole) ہوتا ہے' اس کا عمل اور اس کا رویہ درحقیقت اس کے نظریات' اس کے افکار' اس کی سوچ اور اس کی فکر پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر سوچ غلط ہے' نقطۂ نظر غلط ہے' قلوب و اذہان پر اگر غلط نظریات و افکار کا تسلط ہے تو ظاہر بات ہے کہ

عمل از خود غلط ہو جائے گا۔ عمل کو درست کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے سوچ کو درست کیجئے' نقطہ نظر کی اصلاح کیجئے' فکر کو صحیح بنیادوں پر استوار کیجئے' اسے صحیح اساس پر reconstruct کیجئے اور تب توقع رکھئے کہ اس کا عمل درست ہو گا اور صحیح خطوط پر استوار ہو گا۔ قرآن مجید کا طریق تزکیہ یہ ہے۔ چنانچہ اس آیت میں تزکیے کا ذکر دراصل ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ کے نتیجے کے طور پر آیا ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کے ذریعے سے جب انسان کے فکر کی اصلاح ہو گئی' اس کے نظریات درست ہو گئے' الحاد و مشرکانہ اوہام کی جڑیں جب انسان کے ذہن اور اس کے قلب سے کٹ گئیں تو گویا اس طریقے سے غلط اعمال' غلط کردار اور غلط عادات کی جڑ بھی کٹ گئی۔ اس لئے کہ ان کے لئے اب غذا مہیا نہیں ہو رہی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ غلط اعمال بالکل اس طرح سے انسانی سیرت سے علیحدہ ہو جائیں گے جس طرح سے پت جھڑ کے موسم میں پتے درختوں سے گر جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے تزکیۂ نفس کے ضمن میں ہمارے صوفیاء نے جو مختلف طریقے اختیار کئے ہیں وہ طریق نبویؐ سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتے۔ ہماری ایک بڑی بدقسمتی یہ بھی رہی ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد ہمارے ہاں اس وحدتِ فکر و عمل میں بتدریج زوال آتا چلا گیا جو دورِ خلافت راشدہ کا طرۂ امتیاز تھی۔ کچھ لوگ قانون اور فقہ کے ماہر بن گئے اور کچھ نے تزکیۂ نفس کے میدان کو اختیار کر لیا۔ اس طریقے سے مختلف گوشوں میں یہ تمام امور بڑھتے چلے گئے اور ہر گوشہ اپنے ہی انداز میں ترقی کرتا اور پروان چڑھتا رہا۔ اس طرح وہ وحدت فکر و عمل جو قرآن مجید نے عطا کی تھی' مجروح ہوئی۔ چنانچہ تزکیۂ نفس کے معاملے میں نہ معلوم کہاں سے یہ نظریات لئے گئے اور کہاں سے یہ نفسیاتی ریاضتیں اور مشقتیں اخذ کی گئیں کہ جن کے ذریعے سے تصفیۂ باطن' تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ میں گہرے احساس کے ساتھ اور علیٰ وجہ البصیرت یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس میدان میں طریق نبویؐ سے کچھ زیادہ ہی دوری ہوتی چلی گئی۔ نبی اکرم ﷺ کا طریقۂ تربیت اور اسلوبِ تزکیہ اس سے بہت مختلف تھا۔

نبی اکرم ﷺ نے تزکیۂ نفس کے لئے جو طریقہ اختیار فرمایا تھا وہ یہی تھا کہ پہلے اس قرآن کے ذریعے سے فکر کی تطہیر کی جائے' نقطۂ نظر اور سوچ کی اصلاح کی جائے' نتیجتاً

غلط اعمال پت جھڑ کے پتوں کی طرح از خود جھڑ جائیں گے یا جیسے اس درخت کے پتے سوکھ کر جھڑ جاتے ہیں جس کی جڑ کاٹ دی گئی ہو۔ یہ ہے تزکیہ کا عمل اور جان لیجئے کہ قرآن مجید ہی درحقیقت اس عمل تزکیہ کا بھی محور ہے۔ "تلاوتِ آیات" کی طرح تزکیے کی اساس اور بنیاد بھی یہی قرآن ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس معاملے میں جو طریقے اختیار کئے گئے ان میں بالعموم قرآن حکیم کو نظرانداز کر دیا گیا۔ علامہ اقبال نے اس تلخ حقیقت کی جانب اپنے ان اشعار میں بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے :

صوفی پشمینہ پوشِ حال مست
از شراب نغمہ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآن محفلش

کہ اس عمل تزکیہ کا سارا تعلق قرآن حکیم سے تو کٹتا چلا گیا اور صوفیوں کا حال بالعموم یہ ہو گیا کہ عراقی یا اس قبیل کے دیگر شعراء کے اشعار سے تو ان کے دلوں میں حرارت پیدا ہوتی ہے لیکن قرآن کو سن کر اُن کی آنکھیں پُرنم نہیں ہوتیں۔ اس لئے کہ تلاوتِ قرآن کے ذریعے سے اندرونی کثافتوں اور کدورتوں کی صفائی کرنے کا جو طریقہ تھا محمد رسول اللہ ﷺ کا' وہ متروک ہوتا چلا گیا اور تزکیہ کا عمل جو درحقیقت براہِ راست نتیجہ تھا ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ کا اسے اس کی اصل سے کاٹ دیا گیا۔ علامہ اقبال نے بعض حقائق کی تعبیر بڑی خوبصورتی سے کی ہے اور اس اعتبار سے میری گفتگو میں اُن کا بار بار حوالہ آرہا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

کُشتن ابلیس کارے مشکل است
زاں کہ اُو گم اندر اعماقِ دل است

کہ ابلیس کو قتل کر دینا اور اس کو بالکل ختم کر دینا بڑا مشکل کام ہے' اس لئے کہ وہ تو لوگوں کے وجود کے اندر سرایت کر جاتا ہے' دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ یہ درحقیقت اس حدیثِ نبویؐ کا ترجمہ یا ترجمانی ہے کہ جس میں حضور ﷺ نے فرمایا :

((اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ))

"بے شک شیطان تو انسان کے وجود کے اندر اس طرح جاری و ساری ہو جاتا ہے جیسے (اس کی رگوں میں) خون دوڑتا ہے۔"

اس کے بعد علامہ اقبال فرماتے ہیں ؂

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتہ شمشیر قرآنش کنی

اس شعر کے پہلے مصرعے میں بھی در حقیقت ایک حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ اس پر صحابہؓ میں سے واقعتاً کسی نے بڑی ہمت کر کے سوال کیا کہ حضور! کیا آپؐ کے ساتھ بھی شیطان ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں ہے' لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حدیث کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ؏

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی

یعنی بہتر یہ ہے کہ تم اس شیطان کو مسلمان کر لو! لیکن اس کا طریقہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ ؏

کشتہ شمشیر قرآنش کنی!

اسے قرآن کی شمشیر سے قتل کرو۔ تمہارے اندر اگر غلط خیالات' غلط رجحانات' غلط جذبات اور غلط شہوات پیدا ہو رہی ہیں تو یہ در حقیقت تمہاری غلط سوچ و فکر اور تمہارے نقطۂ نظر کے کج ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ یہ قرآن ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہاری سوچ کو صحیح کرے گا' تمہارے نقطۂ نظر کو درست کرے گا' اور تمہارے نظامِ اقدار (Value System) کو صحیح بنیادوں پر استوار کرے گا۔ یہ ہے وہ طریقہ کہ جس سے تمہاری شخصیت میں انقلاب آئے گا اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غلط عادات اور غلط افکار کے دھبے تمہاری شخصیت سے خود بخود دور ہوتے چلے جائیں گے اور باطن کے اس انقلاب کے بعد ہی تم اس قابل ہو سکو گے کہ خارج میں بھی انقلاب برپا کر سکو!

میں یہاں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس انقلابی عمل میں قرآن حکیم کو جو اہمیت حاصل ہے اور جس کو بڑے ہی اجمال کے ساتھ مولانا حالی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؂

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں اس حقیقت کو علامہ اقبال مرحوم نے کماحقہ سمجھا ہے اور اس کا ادراک کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی عظمت کا بیان جس طرح ہمیں ان کے ہاں ملتا ہے' وہ اس دور کے کسی اور شخص کے ہاں نہیں ملتا۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن
آں کتابِ زندہ قرآن حکیم
حکمت اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثل حق پنہاں و ہم پیداست اُو
زندہ و پائندہ و گویاست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

ان اشعار میں سے آخری شعر میں علامہ اقبال نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ جب یہ قرآن کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے' اس کے اندر ایک عظیم انقلاب آ جاتا ہے' اس کی سوچ' اس کا فکر اور اس کے نظریات بدل جاتے ہیں' اس کی اقدار' اس کا نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب گویا کہ وہ مکمل طور پر ایک بدلا ہوا انسان ہے اور اس کے اندر سے جو یہ تبدیلی ابھری ہے' یہی درحقیقت صحیح طور پر خارج میں ایک تبدیلی برپا کرے گی اور اس طرح تمام غلط رویئے اور تمام غلط اعمال خود خود بخود ختم ہوتے چلے جائیں گے' کیونکہ اندر سے ان کو غذا دینے والی جڑیں اب کاٹی جا چکی ہیں۔

تعلیم کتاب

تلاوت آیات اور تزکیۂ نفوس کے بعد تیسرا مرحلہ "تعلیم کتاب" کا ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا :

﴿ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ ﴾

"اور وہ تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب کی۔"

یہاں ایک بات نوٹ کر لینی چاہئے کہ جیسا کہ آغاز میں عرض کیا جا چکا ہے "تلاوتِ آیات" میں بھی پیش نظر قرآن ہے۔ لیکن یہاں پھر جو کتاب کا لفظ آیا ہے تو اس میں یقیناً قرآن مجید کا کوئی دوسرا پہلو پیش نظر ہے۔ اس طرح مختلف الفاظ سے قرآن مجید ہی کے مختلف گوشوں یا مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید میں لفظ "کتاب" بالعموم قانون کے لئے آتا ہے، مثلاً کسی چیز کے وجوب اور فرضیت کا بیان "كُتِبَ" کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا گیا : ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾ "تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا" ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ ﴾ "تم پر قتال فرض کر دیا گیا"۔ ایسے ہی وصیت کے وجوب کے بارے میں جو ابتدائی حکم تھا اس کے الفاظ ہیں : ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَاۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ....... ﴾ "تم پر واجب کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آموجود ہو اور اگر وہ کچھ مال چھوڑ کر جا رہا ہو تو والدین اور رشتے داروں کے لئے وصیت کر جائے!" کہیں آتا ہے : ﴿ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ.... ﴾ "یہاں تک کہ قانون اپنی اصل مدت کو پہنچ جائے"۔ تو لفظ "کتاب" کا اطلاق اس کی پوری ہمہ گیریت کے ساتھ پورے قرآن مجید پر بھی ہو گا۔ لیکن جب قرآن کے مختلف پہلوؤں کے لئے مختلف الفاظ استعمال کئے جا رہے ہوں تو "کتاب" سے مراد قوانین اور احکام ہوں گے۔ چنانچہ آیت زیرِ مطالعہ میں انقلابِ نبوی ؐ کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لئے مختلف الفاظ آ رہے ہیں۔ سب سے پہلے فرمایا : ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ اور یہاں "تلاوت آیات" سے مراد لازمی طور پر قرآن حکیم ہی کی آیات کی تلاوت ہے۔ اس کے بعد ﴿ يُزَكِّيْهِمْ ﴾ کے الفاظ میں تزکیۂ نفوس کا ذکر کیا گیا جو اسی کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ پھر

﴿ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ ﴾ میں جو لفظ "کتاب" دوبارہ آیا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد احکامِ شریعت (DOs AND DON'Ts) ہیں 'یعنی یہ کرو اور یہ نہ کرو! یہ حلال ہے اور یہ حرام!

احکامِ شریعت میں حکمت تدریج

حلال و حرام کے احکام دینے میں یہ تدریج اور ترتیب برقرار رکھی گئی ہے کہ انہیں قلوب و اذہان کو بدلے بغیر نافذ نہیں کیا گیا۔ جب ذہن و فکر کی تبدیلی عمل میں آچکی' دلوں کی دنیا میں ایمان جاگزیں اور راسخ ہو چکا اور بنیادی طور پر برے کردار اور برے اخلاق سے انسان کا دامن صاف ہو چکا تو اب یوں سمجھئے کہ گویا زمین میں ہل چل چکا ہے اور وہ بیج ڈالے جانے کے لئے پوری طرح تیار ہے۔ اب بیج ڈالیں گے تو وہ بیج بار آور ہو گا' نتیجہ خیز ہو گا۔ زمین کو تیار کئے بغیر بیج ڈال دیا جائے تو بیج ضائع ہو جائے گا۔ چنانچہ جب ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ کا عمل کیا جا چکا اور تزکیے کے بنیادی تقاضے پورے ہو چکے' تب کہا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو! اور اس وقت ہر حکم کو پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کیا گیا۔ غور کیجئے کہ قرآن میں پہلے ہی حلال اور حرام کے احکام کیوں نہیں آ گئے اور ان کا نزول اتنی دیر کے بعد کیوں ہوا؟ یا پورا قرآن یک دم کیوں نازل نہیں کر دیا گیا؟ اس کی وجہ یہی حکمت تدریج ہے۔ پہلے وہ آیات اور سورتیں اتریں جنہوں نے قلوب و اذہان کی دنیا میں ہل چلایا اور اس میں سے کثافتوں کو نکال کر باہر پھینک دیا' ایمان کی بنیادوں کو استوار کیا' نتیجتاً بنیادی انسانی اخلاق پروان چڑھے اور گندگیوں سے سیرتیں پاک ہو گئیں۔ اس طرح جب یہ زمین پوری طرح تیار ہو گئی تو اس میں بیج ڈالا گیا اور یہ بیج خوب بار آور ہوا۔ یہ ہے وہ حکمت اور تدریج کہ جو قرآن مجید نے اپنے نزول میں ملحوظ رکھی' یا صحیح تر الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ قرآن کے نازل کرنے والے نے اس کے نازل کرنے میں پیش نظر رکھی اور اسی حکمت اور اسی تدریج کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے انقلاب برپا کیا۔

یہ اسی کا مظہر ہے کہ ذہنی و قلبی تربیت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو بھی حکم دیا گیا وہ انہوں نے بلا تامل قبول کیا۔ انہیں جس چیز کے چھوڑنے کو کہا گیا وہ انہوں نے فوراً ترک

کردی۔ غور کیجئے کہ شراب جیسی چیز جسے طبی دنیا میں بھی "habit making" مانا جاتا ہے اور جو انسان کے پورے جسمانی نظام کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جاتی ہے کہ پھر اس کا دفعتاً چھوڑ دینا نقصان دہ ہو سکتا ہے، جب اس کی حرمت کا حکم آتا ہے تو قرآن مجید اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اعجاز دیکھئے کہ شراب کا جام اگر کسی کے ہونٹوں تک بھی پہنچا ہوا تھا تو اس کا ایک گھونٹ اس کے اندر نہیں گیا۔ شراب کی حرمت کے اعلان کے ساتھ ہی اس کے تمام برتن توڑ ڈالے گئے اور مدینے کی گلیوں میں شراب کی ندیاں بہہ نکلیں۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے کہ جن کی گھٹی میں شراب تھی، جن کے ہاں شراب کا بالکل وہی تصور تھا جو آج آپ کو مغربی تہذیب میں نظر آتا ہے کہ پانی تو پانی ہے، لیکن پینے کی اصل شے شراب ہے۔ شراب ان کی تمدنی زندگی کا جزو لاینفک تھی، شراب پیتے ہوئے ان کی ساری ساری عمریں بیت گئی تھیں، شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی، لیکن جب شراب کی حرمت کا حکم آ گیا تو انہوں نے اس کو کسی توقف کے بغیر چھوڑ دیا، اور اس شان کے ساتھ چھوڑا کہ پھر پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ یہ درحقیقت محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ ہے اور اس معجزے کی بنیاد یہی تدریج اور حکمت ہے۔

احکام کی تنفیذ سے پہلے ان کے دلوں میں ایمان راسخ ہو چکا تھا۔ یہ یقین پیدا ہو چکا تھا کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہہ رہے ہیں اپنی طرف سے نہیں، اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ ﴾ انہیں اللہ کی ذات اور آخرت پر یہ پختہ یقین حاصل ہو چکا تھا کہ مرنے کے بعد اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، جہاں تمام اعمال کی جوابدہی ہوگی اور یہ کہ اصل زندگی آخرت کی ابدی زندگی ہے۔ جب یہ یقین پیدا ہو چکا تو اب کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ جب سود کی حرمت کا حکم آیا تو اس کے لئے کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں پڑی۔ تجارت کے ساتھ اس کی ظاہری مشابہت کی بناء پر اگر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ ﴿ اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ﴾ تو جواب صرف یہ دیا گیا : ﴿ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ کہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سُود کو حرام ٹھہرایا ہے۔ تو جو کوئی اللہ کو مانتا ہو اور یہ ایمان رکھتا ہو کہ محمد (ﷺ) یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے، اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں، تو اب اس کے لئے چون و

چرا کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس کے برعکس امریکہ میں بڑے ٹھوس اعداد و شمار کی بنیاد پر شراب پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ شراب نوشی کے نقصانات گنوائے گئے‘ بتایا گیا کہ ٹریفک کے حادثات اکثر و بیشتر شراب نوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں‘ کئی بار ایسا ہو چکا ہے کہ کسی ذمہ دار افسر کو شراب کے نشے میں مست کر کے جاسوس حسینائیں اس سے قومی اہمیت کے بڑے بڑے راز اگلوا کر لے گئیں۔ لیکن اس طرح کے متعدد حقائق بیان کرنے اور پورے اعداد و شمار مہیا کرنے کے بعد بھی جب اس پر پابندی عائد کی گئی تو یہ سارے اعداد و شمار‘ یہ سارا فلسفہ اور سارے طبی اور سائنسی حقائق دھرے کے دھرے رہ گئے اور ع "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی" کے مصداق پابندی کا یہ حکم قبول نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حکم واپس لینا پڑا اور شراب کی حلت کو پھر سے تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا اس کے process میں ہمیں ایک تدریج نظر آتی ہے۔ چنانچہ پہلے کتابِ الٰہی کی تلاوت آیات اور پھر اسی کے ذریعے سے تزکیۂ نفوس کے بعد تعلیم کتاب یعنی احکامِ شریعت کی تعلیم اور تنفیذ کا مرحلہ آتا ہے۔ اس مرحلے پر اب اوامر و نواہی‘ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی پوری فہرست دے دی گئی اور اس کی تنفیذ بھی ہو گئی۔

تعلیم حکمت

انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کا آخری مرحلہ "تعلیم حکمت" کا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا : ﴿ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ﴾ "حکمت" کا لفظ اس سے پہلے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ضمن میں آیا تھا : ﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ﴾ اُس مقام پر لفظ "حکمت" پر گفتگو کی گئی تھی اور عرض کیا گیا تھا کہ عربی میں "ح ک م" کا مادہ بنیادی طور پر کسی شے کی پختگی اور استحکام کے لئے آتا ہے۔ حکمت انسانی عقل اور شعور کی پختگی ہے۔ انسان کے اندر غور و فکر کی جو استعداد ہے اس کا پختہ (mature) ہو جانا اور اس میں اصابت رائے کی صلاحیت کا پیدا ہو جانا حکمت ہے اور یہ انسان کی صلاحیتوں میں بلند

ترین چیز ہے۔ عام تعلیمی نظام میں بھی تربیت انسانی کے نقطہٴ نظر سے یہ تدریج ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ کسی بچے کو آپ پہلے تاریخ کے واقعات کا مطالعہ کروائیں گے اور اس کو یاد کروائیں گے کہ فلاں فلاں واقعات کب اور کیسے ہوئے۔ اس کے بعد پھر ایک مرحلہ "فلسفۂ تاریخ" کا آتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ فلاں قوم کو شکست کیوں ہوئی' فلاں تہذیب کو عروج کیوں حاصل ہوا اور فلاں تمدن زوال پذیر کیوں ہوا؟ وغیرہ۔ اسی طرح آپ جغرافیہ میں پہلے یہ پڑھائیں گے کہ فلاں ملک کی آب و ہوا کیا ہے' وہاں کی زرعی پیداوار کیا ہے اور وہاں کون کون سے معدنی ذخائر پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد پھر طبیعی جغرافیہ (Physical Geography) میں یہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ یہ تغیر و تبدل کیوں ہے؟ یہ موسم اس طرح کیوں بدلتے ہیں؟ فلاں جگہ یہ چیز کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ اور فلاں خطے میں یہ معدنیات کیوں پائی جاتی ہیں؟ تو درحقیقت یہ "کیوں اور کیسے؟" ہر گوشۂ علم میں چوٹی کی چیز ہے۔ اسی طریقے سے دین کا معاملہ ہے۔ انسانی ذہن اور شعور تربیت پا کر وہ پختگی حاصل کرلیں کہ انسان دین کے "کیوں اور کیسے" کو سمجھ سکے تو یہ "حکمت" ہے۔ فاتح دورِ حاضر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق کتاب "حُجَّةُ اللّٰهِ البالِغة" کا موضوع یہی حکمت دین ہے کہ احکامِ شریعت میں کیا حکمتیں ہیں' ان کے کیا مقاصد ہیں۔

دین پر عمل کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کو شریعت کے اوامر و نواہی کی پابندی کرنی ہے۔ "سمع و طاعت" اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔

Theirs not to reason why?
Theirs but to do die!

لیکن اس سے بلند تر سطح یہ ہے کہ وہ بصیرت باطنی اور enlightment پیدا ہو جائے کہ جس سے نظر آنے لگے کہ یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے' اس کی حکمتیں کیا ہیں' اس کی غرض کیا ہے' اس کی علت کیا ہے' اس کی مصلحتیں کیا ہیں! انسان کے اپنے مفاد میں اور نظام اجتماعی کے اپنے مصالح کے اعتبار سے دین کے ان احکام کی کیا اہمیت اور کیا مقام و مرتبہ ہے!! اس مرحلے پر پہنچ کر حکم بوجھ محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک نعمت معلوم ہونے لگتا ہے۔ تب

شریعت کے اوامر و نواہی طبیعت کے لئے کسی ناگوار کیفیت کے حامل نہیں رہ جاتے' بلکہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے انعام و احسان ہونے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں شریعت کو نعمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے : ﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ..... ﴾ یعنی یہ اللہ کا انعام ہے کہ اُس نے تمہیں تمام پیچیدہ اور پُر پیچ راہوں میں ایک درمیانی راہ "صراط مستقیم" عطا فرمادی اور ایک متوازن اور معتدل نظام تمہیں عطا فرمایا۔ یہ سراسر انعام خداوندی ہے' اور اس نعمت کا اتمام ہوا ہے محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ سورۃ البقرہ میں اس "حکمت" کے بارے میں فرمایا گیا : ﴿ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ﴾ کہ جس کو حکمت عطا کر دی گئی اسے تو خیر کثیر سے نواز دیا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ حکمت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی دولت ہے اور اللہ کا اُس شخص پر بہت ہی بڑا احسان ہے جسے اُس نے حکمت سے نوازا ہو۔ علامہ اقبال نے اسے "اسرارِ دین" سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے کہ می نازی بہ قرآنِ حکیم
تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن!
نکتہ شرعِ مبیں را فاش کن!

تو حکمت دین کی تعلیم اور اس کا عام کیا جانا انقلابِ نبوی کے اساسی منہاج میں چوٹی کا معاملہ ہے۔ گویا یہ اس کا مرتبۂ کمال اور نقطۂ عروج ہے۔

فرد اور معاشرے میں انقلاب کا لائحہ عمل

اب آپ ان چاروں اصطلاحات کو ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن کے سامنے لائیے : (۱) یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ (۲) وَیُزَکِّیْھِمْ (۳) وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ (۴) وَالْحِکْمَۃَ ـــــ اور دیکھئے کہ انقلاب کے عمل میں ان کو بتدریج کیسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کا کوئی عزیز' کوئی نوجوان ہے جو آپ کو محبوب ہے اور آپ پورے خلوص کے ساتھ چاہتے ہیں کہ وہ دین کی طرف آئے' یا یوں تعبیر کیجئے کہ اس میں دینی

انقلاب برپا ہو جائے۔ اس کی کچھ عادات اور دلچسپیاں ایسی ہیں کہ جو آپ کی نظر میں کھٹکتی ہیں' اس کے صبح و شام کا رنگ کچھ بدل گیا ہے۔ آپ اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے فکر اور ذہن کا جائزہ لیجئے کہ کہیں اس کے ذہن میں کوئی "برٹرینڈ رسل" تو نہیں ہے' وہاں کوئی "ساخت" اور اس کا فلسفہ موجودیت تو مسلط نہیں ہے' کہیں کسی "فرائیڈ" کے نظریات نے تو اس پر تسلط حاصل نہیں کر لیا' کہیں کسی اور کا نظریہ تو نہیں ہے کہ جو اس کے ذہن اور دل پر مستولی ہو گیا ہو۔ اگر آپ یہ تجزیہ نہیں کر سکتے اور اس کا مداوا نہیں کر سکتے' آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے سے اس کے دل میں نورِ ایمان' اللہ کا یقین' آخرت کا یقین' جنت و دوزخ کا یقین اور وحی و رسالت کا یقین پیدا نہیں کر سکتے' تو جان لیجئے کہ آپ کی وہ ساری خواہش دھری رہ جائے گی اور اس کے اندر کوئی تبدیلی برپا نہ ہو سکے گی۔ وہ اگر سعادت مند ہے تو آپ کے سامنے چپ ہو جائے گا' گردن جھکا دے گا۔ ہو سکتا ہے آپ کے دباؤ کے تحت' جہاں آپ کے سامنے ہو' نماز بھی پڑھ لے' لیکن اس کی فکر کچھ اور ہے' اس کی سوچ کچھ اور ہے ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الاّ اللہ!

اس کی فکر اور اس کی سوچ پر تو کچھ اور چیزوں کا تسلط ہو چکا ہے' جن میں کہیں نماز یا روزے کی گنجائش ہی نہیں۔

اوامر و نواہی اور حلال و حرام کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی صاحب ایمان ہو' وہ وحی و رسالت اور کتاب کو مانتا ہو' اگر وہ بنیاد ہی موجود نہ ہو تو کیا حلال اور کیا حرام؟ اس کے ذہن میں کس چیز کے بارے میں فرض کا تصور قائم ہو گا اور کس چیز کو وہ ممنوع اور حرام سمجھے گا؟ یہ ساری چیزیں اس وقت تک بے بنیاد ہیں جب تک ایمان دل کے اندر پیدا نہ کیا جائے۔ یہی ایک واحد راہِ عمل ہے کسی شخص کو بدلنے کی۔ اور یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ اس سارے عمل کا مرکز و محور قرآن حکیم ہے۔ اگر "تلاوتِ آیات" کے ذریعے اس میں ذہن و فکر کی تبدیلی آتی ہے تو اس کی بُری عادتیں خود بخود بدل جائیں گی اور سب بُری لتوں سے وہ خود بخود آزاد ہوتا چلا جائے گا اور اب آپ کہ ایک ایک چیز کے لئے

علیحدہ علیحدہ دردِ سر مول لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جب وہ جڑیں کٹ جائیں گی جن سے ان عاداتِ فاسدہ کے پتوں کو فاسد غذا بہم پہنچ رہی تھی تو وہ خود بخود خشک ہو کر گر پڑیں گے۔ اب وہ وقت آئے گا کہ آپ اسے بتائیں کہ یہ ہے دین کا حکم' اور وہ اس پر عمل پیرا ہو جائے گا۔ اور یہ عمل مصنوعی نہیں ہو گا' بلکہ فطری ہو گا۔ اس کے بعد اگر اس میں استعداد ہے تو اسے مرتبۂ حکمت تک پہنچایئے۔ یہاں پہنچ کر اس کی شخصیت کو دین کے بارے میں ٹھہراؤ' تمکن اور دوام حاصل ہو گا۔ اس کے کیا ہی کہنے ہیں! ظاہر بات ہے کہ حکمت کا یہ مقام کچھ نرالا ہی مقام ہے۔ یہاں انسان گویا کہ اپنی بصیرتِ باطنی سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ حق یہی ہے۔ یہ اس کا ذاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ دین میں کیا مقدم ہے' کیا مؤخر ہے۔ کس چیز کی حیثیت جڑ کی ہے اور کس کی فرع کی۔ اب وہ اندھے کی طرح ٹامک ٹوئیے نہیں مار رہا ہوتا' بلکہ وہ دین کی تمام اقدار کو ان کے صحیح مقام پر صحیح توازن واعتدال کے ساتھ برقرار رکھتا ہے۔ یہ ہے مرتبۂ حکمت' کہ جس کو عطا ہو گیا اسے خیر کثیر عطا ہو گئی۔

اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیجئے تو یہ مضمون مکمل ہو جائے گا۔ جس طرح کا معاملہ ایک فرد نوع بشر کا ہے بالکل اسی طرح ایک قوم یا اجتماعیت کے تحت زندگی بسر کرنے والے ایک مجموعۂ افراد کا ہے۔ ایک ہیئت اجتماعیہ سے منسلک ہونے والے افراد بھی مجموعی طور پر ایک فرد (individual) ہی کی طرح کا رویہ رکھتے ہیں۔ اور جس طرح ایک فرد کے وجود میں دماغ قوتِ فیصلہ کا حامل ہوتا ہے اور پورے وجود پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح ایک ہیئت اجتماعیہ میں ایک "ذہین اقلیت" اس پورے مجموعۂ افراد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دماغ میں پکڑنے کی طاقت نہیں ہے' یہ طاقت ہاتھ میں ہے' لیکن پکڑنے کا حکم اسے دماغ سے ملتا ہے۔ ہاتھ کیا پکڑے اور کیا نہ پکڑے' اس کا فیصلہ بھی دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح پاؤں چل سکتے ہیں' لیکن چلیں نہ چلیں' اور اگر چلیں تو کدھر جائیں کدھر نہ جائیں' اس کا فیصلہ دماغ کرے گا۔ نوع انسانی کے ایک فرد میں ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء وجوارح ہیں' لیکن ان سب کو دماغ کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ گویا کہ انسان کے دو ڈھائی من کے وجود میں پاؤ ڈیڑھ پاؤ کے دماغ کو ایک حکمران کی حیثیت حاصل ہوتی

ہے۔ بالکل اسی طریقے سے جان لیجئے کہ کسی قوم' کسی معاشرے' کسی سوسائٹی' کسی کمیونٹی یا کسی ہیئت اجتماعیہ میں جو ایک ذہین اقلیت (intellectual minority) یا intelligentsia ہوتی ہے' جسے آپ brain trust سے تعبیر کر سکتے ہیں' اس پوری ہیئت اجتماعیہ کو کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے لوگ اگرچہ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں' لیکن یہ لوگ اپنے معاشرے' اپنی قوم اور اپنے ملک میں بالکل اسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ جو اہمیت ایک فردِ بشر میں اس کے اپنے دماغ کو حاصل ہے۔ یہ سوچتے ہیں اور معاشرے کے رخ کا تعین کرتے ہیں۔ باقی عوام الناس اعضاء و جوارح کی مانند ہیں۔ جدھر یہ رخ کر لیں گے پورا معاشرہ اُدھر رخ کر لے گا' بالکل اسی طرح جیسے دماغ کے فیصلے کے تحت پاؤں چلتے اور ہاتھ حرکت کرتے ہیں۔

آپ کسی بھی معاشرے میں تبدیلی برپا کرنا چاہتے ہیں' کسی قوم یا ہیئت اجتماعیہ کو اسلام کے حق میں بدلنا چاہتے ہیں یا یوں کہئے کہ کسی جگہ پر بھی آپ اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے نبی اکرم ﷺ کے طریق انقلاب پر اساسی منہاج یہی ہو گا کہ پہلے اس ذہین اقلیت کو تبدیل کیجئے۔ اگر اس کو آپ اسلام کے حق میں convert کر لیں اور اس میں ایمان و یقین کی روشنی پیدا ہو جائے تو اس طرح اس حلقے اور طبقے میں ایک ایسا مضبوط نیوکلیس پیدا ہو جائے گا جس نے دین کی بنیادی اقدار کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کیا ہو گا' نہ کہ محض اعتقادی طور پر صرف ایک "dogma" کی حیثیت سے۔ چنانچہ اس ذہین اقلیت اور brain trust کے تبدیلی قبول کرنے سے مجموعی طور پر پورا معاشرہ تبدیلی قبول کر لے گا۔ ورنہ آپ عوام میں وعظ و نصیحت کرتے رہئے تو اگرچہ اس سے عوام الناس کے اندر ایک رجوع عام بھی ہو جائے' تبدیلی برپا نہیں ہو گی۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے اس چھوٹی سی مثال پر غور کر لیجئے کہ ہمارے ہاں کسی زمانے میں ترقی پسند ادیبوں نے بعض اصطلاحات کا استعمال شروع کیا اور آج وہ اصطلاحات ہمارے معاشرے کے نچلے طبقات تک پہنچ گئی ہیں۔ "استحصال" جیسا بھاری بھر کم لفظ آج کسی تانگے بان اور کسی ریڑھی چلانے والے کی زبان پر آپ کے سننے میں آئے گا' اس لئے کہ یہ عمل ان لوگوں سے چلا تھا جو اس ملک کے اندر غور و فکر کرنے

والے اور سوچ بچار کرنے والے لوگ تھے۔ اس "ذہین اقلیت" نے ایک فلسفے کو قبول کیا تھا اور پھر وہ فلسفہ اس معاشرے کے اندر سرایت کرتا چلا گیا۔ آپ کسی پارٹی کو تو ban کر سکتے ہیں، لیکن فکر پر کوئی قدغنیں عائد نہیں کی جا سکتیں، فکر کے لئے کسی پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بخود پھیلتا ہے اور کسی ملک یا کسی معاشرے میں اس کو قید و بند میں ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت کی دنیا میں جبکہ فاصلے معدوم ہو گئے ہیں آپ کسی ملک یا خطۂ زمین کو محفوظ خطہ بنا کر نہیں رکھ سکتے کہ یہ فکر وہاں نہ آنے پائے۔ اصل معاملہ فکر ہی کا ہے۔ اگر فکر بدلے گا، سوچ بدلے گی، تو انسان بدلے گا۔ انسان کی انفرادی تبدیلی کے لئے بھی فکر کی تبدیلی لازمی ہے اور کسی معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کے لئے بھی فکر کی تبدیلی ناگزیر ہے۔ اسلامی انقلاب کے لئے فکری بنیاد بھی قرآن حکیم سے مہیا ہوتی ہے اور اس کا پورا اساسی منہاج بھی قرآن حکیم ہی پر مبنی ہے۔ ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس ضمن میں بعض لوگوں کو مغالطہ اور اشتباہ لاحق ہو سکتا ہے کہ کیا اتنا عظیم انقلاب اور اتنی بڑی تبدیلی صرف ایک کتاب کے بل پر پیدا ہو جائے گی؟ میں انہیں دعوت دوں گا کہ ذرا نگاہ دوڑائیے، اس وقت اشتراکی نظام روئے ارضی کے کتنے بڑے حصے پر قائم ہے۔ پورے مشرقی یورپ، پورے شمالی ایشیا، بلکہ چین سمیت ایشیا کے اکثر و بیشتر حصے کے علاوہ دنیا کے کئی دور دراز ممالک میں یہ جو نظام قائم ہے اس کا سراغ لگائیے کہ یہ کس کا نتیجہ ہے؟ یہ سب کارل مارکس کی کتاب داس کیپٹل (Das Capital) اور اس کے فلسفے کا اثر ہے کہ ذہنوں نے جس کو قبول کیا اور ان پر اس کی چھاپ قائم ہوئی۔ اور یہ انقلابات درحقیقت اسی کی بنیاد پر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے مارکس کے بارے میں کہا تھا ؏

"نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب"

اس کی بغل میں "کتاب" تھی، اور یہ بات کسی کو پسند ہو یا ناپسند ہو، کوئی اسے غلط سمجھے یا

صحیح‘ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ سارے انقلابات در حقیقت اسی کتاب کا ایک ظہور اور اسی کتاب کا ایک بروز ہیں۔ تو ذرا سوچئے کہ ایک انسان کی کاوش‘ اس کی تصنیف کردہ ایک کتاب اگر دنیا میں اتنے وسیع و عریض پیمانے پر اتنے وسیع و عریض خطے میں انقلاب برپا کر سکتی ہے تو کیا کتاب اللہ دنیا میں انقلاب برپا نہیں کر سکتی؟ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کتاب کی طرف approach درست ہو‘ اس کتاب کو اس کا صحیح مقام دیا گیا ہو‘ اس کتاب سے واقعتاً وہ کام لیا جائے کہ جس کے لئے وہ نازل کی گئی ہے‘ جس کے لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی شان میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں ﴿ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ﴾ جس کے ذریعے سے افراد بدلے‘ ان کے اندر انقلاب آیا اور پھر انہوں نے ساری انقلابی جدوجہد سے گزر کر انقلابِ محمد ﷺ کی عملی تکمیل فرمادی۔

سورۃ الجمعہ کا عمود معین ہو جانے کے بعد اور اس کی مرکزی آیت کے مفہوم و معنی کو کسی حد تک سمجھ لینے کے بعد اب آیئے کہ اس کا آغاز سے تسلسل کے ساتھ مطالعہ شروع کریں۔ ہمیں اس کی ایک ایک آیت پر بھی اجمالاً غور کرنا ہے اور خاص طور پر ہر آیت کا اس سورۃ کے عمود اور مرکزی مضمون کے ساتھ جو ربط بنتا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش بھی کرنی ہے۔

پُرجلال آغازِ کلام

فرمایا :

﴿ یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۝ ﴾

”تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے‘ (اس اللہ کی) جو الملک (یعنی بادشاہ) ہے‘ القدوس (یعنی پاک) ہے‘ العزیز (یعنی زبردست) ہے‘ الحکیم (یعنی کمال حکمت والا) ہے۔

یہ پہلی آیت گویا اس سورۂ مبارکہ کیلئے ایک نہایت پُرشکوہ اور پُرجلال تمہید اور آغازِ کلام ہے۔ تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم اس سے پہلے سورۃ التغابن کے درس کے ضمن

میں عرض کیا جاچکا ہے۔ یہاں یہ نوٹ فرمالیں کہ سورۃ الصف میں اس کا ذکر صیغہ ماضی میں تھا: ﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ جبکہ یہاں فعل مضارع آیا ہے: ﴿ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اس طرزِ بیان کو اختیار کر کے تسبیح باری تعالیٰ کے ضمن میں قرآن حکیم نے گویا زمان و مکان کا احاطہ کرلیا ہے۔ اللہ کی تسبیح اس کائنات میں ہر آن اور ہر لحظہ ہو رہی ہے اور کائنات کے ہر گوشے میں یہ عمل جاری ہے۔ ﴿ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ کے الفاظ پر غور کیجئے۔ یہ دراصل کل سلسلۂ کون و مکان' کل کائنات کے احاطے کیلئے قرآن حکیم میں مستعمل ہیں۔ اسی طرح فعل ماضی اور فعل مضارع کو جمع کر لیجئے تو کل زمان کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ فعل مضارع عربی زبان میں حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہے۔ چنانچہ تسبیح کے لفظ کو ماضی اور مضارع میں لا کر قرآن حکیم نے گویا زمان کا احاطہ بھی کرلیا۔

اللہ کے چار اسماءِ حسنیٰ اور نبی اکرم ﷺ کے فرائض چہارگانہ

اس آیۂ مبارکہ کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے چار اسماء وارد ہوئے ہیں اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ قرآن مجید میں اللہ کے اسماء وصفات عام طور پر آیات کے آخر میں وارد ہوتے ہیں' لیکن اکثر و بیشتر جوڑوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ مثلاً وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ' وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ' وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ـــــ وقِس علیٰ ذٰلک۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اکٹھے چار اسماء وارد ہوئے ہیں۔ نوٹ کیجئے کہ اس کا اصل سبب اس سورۂ مبارکہ کا عمود ہے۔ ذہن میں تازہ کیجئے کہ اس مرکزی آیت میں جس پر ہم غور کر چکے ہیں' نبی اکرم ﷺ کے طریق کار کے ضمن میں چار اصطلاحات آئی ہیں' یا یوں کہہ لیجئے کہ آپؐ کی چار شانوں کا ذکر ہے: تلاوتِ آیات' تزکیہ' تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔ درحقیقت ان چاروں کا بڑا گہرا ربط ہے ان چار اسماءِ حسنیٰ کے ساتھ! ـــــ وہ "الملک" ہے۔ یعنی بادشاہِ ارض و سماوات ہے۔ چنانچہ اس کی آیات پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں' جیسے کوئی منادی کرنے والا شہنشاہ کے فرامین (Proclamations) لوگوں کو سنا رہا ہو۔ گویا ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ ﴾ عکس ہے اللہ تعالیٰ

کے اسم گرامی "اَلۡمَلِكُ" کا۔ دوسری شان اللہ کی یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ اَلۡقُدُّوۡسُ ہے' یعنی انتہائی پاک۔ غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ قدوسیت کا بڑا گہرا تعلق ہے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بیان کردہ دوسری اصطلاح ﴿ وَیُزَکِّیۡهِمۡ ﴾ یعنی عمل تزکیہ کے ساتھ ـــــ اسی طرح ﴿ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ ﴾ (وہ تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب یعنی احکامِ شریعت کی) میں اللہ تعالیٰ کی شان "العزیز" کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ زبردست ہے' مختارِ مطلق ہے' وہ جو چاہے حکم دے' بندوں کا کام ہے اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت! سورۃ التغابن میں یہ مضمون آچکا ہے : ﴿ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا ﴾ "سنو اور اطاعت کرو"۔ سورۃ البقرۃ میں سود کے بارے میں فرمایا : ﴿ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ کان کھول کر سن لو! اللہ نے سود حرام کیا ہے اور بیع کو حلال ٹھہرایا ہے' تم کون ہوتے ہو اُس پر اعتراض کرنے والے؟ یہ ہے "العزیز" کا مفہوم۔ یعنی ایک ایسی ہستی جس کے اختیارات پر کوئی تحدید نہ ہو' کوئی limitations نہ ہوں' کوئی checks and balances نہ ہوں' مختارِ مطلق! ـــــ اور آخری اور چوتھا لفظ جو اللہ کی شان میں آیا ہے "الحکیم" اس کا ربط و تعلق گویا از خود ظاہر ہے نبی اکرم ﷺ کے فرائض چہارگانہ میں سے چوتھے کے ساتھ ہے جو درحقیقت نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہاج کا نقطۂ عروج ہے' یعنی تعلیم حکمت!

تو پہلی آیت کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک پُرشکوہ اور پُرجلال تمہید ہے۔ اور اس کے بعد آئی وہ آیت جس پر ہم غور کر چکے : ﴿ هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیۡهِمۡ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ ﴾ اس "هُوَ" کو جوڑیئے پہلی آیت کے ساتھ کہ محمد ﷺ کا بھیجنے والا ہے کون؟ وہ کہ جس کی تسبیح میں آسمان و زمین کی ہر شے ہمیشہ سے اور ہر آن لگی ہوئی ہے اور ہمیشہ ہمیش تسبیح میں لگی رہے گی' جو الملک ہے' القدوس ہے' العزیز ہے' الحکیم ہے۔ وہ ہے کہ جس نے اٹھایا اُمیین میں سے ایک رسول جو انہی میں سے ہے۔ جہاں تک ان اصطلاحات کا تعلق ہے ان پر تو ہم کسی درجے میں غور و فکر کر چکے ہیں' اب ہمیں اس آیۂ مبارکہ کے بعض دوسرے پہلوؤں پر توجہ کو مرتکز کرنا ہے۔

اُمی کا مفہوم

اُمِّيِّيْنَ جمع ہے اُمی کی ـــــ یہ لفظ "اُم" سے بنا ہے۔ "اُم" عربی زبان میں ماں کیلئے مستعمل ہے۔ "اُمی" سے گویا ایک ایسی کیفیت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جیسے کوئی شخص بطن مادر سے برآمد ہوا ہو اور وہ اسی طرح کی کیفیت میں برقرار رہے۔ تو اگرچہ اس اعتبار سے ایک سے زائد مفہوم مراد لئے جاسکتے ہیں' لیکن اس لفظ کا استعمال خاص طور پر ان لوگوں کیلئے ہے کہ جن کے ہاں رواجی تعلیم یعنی لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہو۔ قرآن مجید نے اصطلاحاً یہ لفظ استعمال کیا ہے بنی اسماعیل کیلئے' اس لئے کہ اوّلاً ان میں پڑھنے لکھنے کا رواج ہی بہت کم تھا اور ثانیاً یہ کہ بنی اسماعیل کے لئے یہ لفظ لایا جاتا ہے بنی اسرائیل کے مقابلے میں' اس لئے کہ وہ اہل کتاب تھے' ان کے ہاں لکھنے پڑھنے کا باقاعدہ رواج تھا۔ ان کے ہاں شریعت تھی' قانون تھا' عدالتیں تھیں' فقہاء تھے' مفتی تھے' لہٰذا بنی اسرائیل کے پس منظر میں یہ بنی اسماعیل اُمی اور اَن پڑھ تھے' ان کے پاس کوئی قانون' کوئی ضابطہ' کوئی کتاب نہیں تھی' یہاں تک کہ لکھنے پڑھنے تک کا رواج نہیں تھا۔

یہاں نوٹ کر لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت اولین "اُمِّيِّيْن" میں تھی۔ آپ کے مخاطب اوّلین یہی اُمی تھے' اصلاً آپ کی بعثت انہی میں ہوئی۔ "مِّنْهُمْ" کا لفظ اس حقیقت کی جانب رہنمائی دے رہا ہے۔ بلکہ اس کے حوالے سے مزید اشارہ کر دیا گیا اس بات کی طرف کہ کسی نبی اور رسول کے لئے اس قوم میں سے ہونا جس کی جانب وہ نبی یا رسول بنا کر بھیجے گئے' درحقیقت اس کے فرائض رسالت اور منصب نبوت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ نبی اس قوم کا جانا پہچانا فرد ہوتا ہے جس کی سیرت و کردار سے وہ واقف ہیں' جو انہی کی زبان بولتا ہوا آتا ہے' اجنبیت کا کوئی پردہ اس کے اور قوم کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔ یہی دلیل قرآن استعمال کرتا ہے اس اعتراض کے جواب میں کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے کسی فرشتے کو نبی بنا کر کیوں نہیں بھیجا جاتا: ﴿لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا﴾ کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو ہم لازماً کسی فرشتے ہی کو پیغامبر بنا کر بھیجتے' جب یہاں انسان آباد ہیں تو ہم نے انسانوں ہی میں سے انبیاء کو مبعوث فرمایا جن کے احساسات وہی

ہوں جو دوسرے انسانوں کے ہیں' جن کے مسائل وہی ہوں جن سے دوسرے انسان دوچار ہوتے ہیں' پیٹ انہیں بھی لگا ہوا ہو' جسم و جان کے تقاضے ان کے ساتھ بھی ہوں' تاکہ وہ اپنے جیسے انسانوں پر تبلیغ کریں تو اتمامِ حجت کر سکیں' کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ جس بات کی تم تبلیغ کر رہے ہو یا جو عملی نمونہ تم ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو انسانوں کے لئے قابل عمل نہیں ہے!

اب آیئے اس آیۂ مبارکہ کے آخری ٹکڑے کی جانب: ﴿ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ : "اور اگرچہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔" بنو اسماعیل کی گمراہی کی تفصیل یہاں بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ ان کے اوہام' ان کے مشرکانہ عقائد' ان کی اخلاقی زندگی کا نقشہ معلوم و معروف ہے۔ "ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کے مصداق وہ تہہ در تہہ گمراہیوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ فکر کی' عقیدے کی' عمل کی' اخلاق کی' غرضیکہ ہر اعتبار سے وہ کجی اور گمراہی کا شکار تھے۔ پھر یہ کہ ان کے معاشرے میں کوئی نظم تھا نہ تنظیم' ہر ایک اپنی جگہ فرعون بے ساماں ہے' کوئی کسی کی بات سننے والا نہیں۔ ﴿ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾ میں گویا اس پوری صورتِ حال کا ایک نقشہ کھینچ دیا گیا۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے دو رُخ

آگے فرمایا: ﴿ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ ﴾ آیت کا یہ ٹکڑا عطف ہو رہا ہے اُمِّیّٖن پر کہ دوسرے کچھ اور بھی ہیں جن کی طرف آپؐ کو مبعوث فرمایا گیا۔ یعنی بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ وَالْاٰخِرِيْنَ مِنْهُمْ۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت اولاً ہوئی ہے اُمیین میں' لیکن آپؐ صرف اُمیین کے لئے رسول بنا نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ "آخرین" یعنی دیگر اقوام کے لئے بھی آپ ﷺ رسول بن کر تشریف لائے تھے۔

اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ آنحضور ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ آپ کی ایک بعثت خصوصی تھی اہل عرب کی طرف' بنو اسماعیل کی طرف' اُمیین کی طرف' جب کہ ایک بعثت عمومی تھی اِلٰى كَآفَّةِ النَّاسِ یعنی پوری نوعِ انسانی کی جانب۔

جیسے کہ فرمایا گیا : ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ "اور اے نبی! ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر"۔ "نہج البلاغہ" میں نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ نبوت کے ابتدائی دور کے ایک خطبے میں آپؐ کے یہ الفاظ منقول ہیں : ((وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ خَاصَّةً وَاِلَی النَّاسِ كَآفَّةً)) "اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری جانب بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم" تو یہ ہے مفہوم اُمیین اور آخرین کا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ یہ آخرین سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی قوم۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ حکمت اور دانائی کی کوئی بات اگر ثریا پر بھی ہو گی تو اس کی قوم کا کوئی نہ کوئی فرد وہاں سے بھی لے آئے گا۔

یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ امت محمدیہؐ کی تشکیل کچھ اس طرز پر ہے کہ اس کا ایک مرکز (Nucleus) ہے جو بنی اسماعیل پر مشتمل ہے جو نبی اکرم ﷺ کے اولین مخاطب تھے۔ خود حضور ﷺ ان ہی میں سے تھے، ان ہی کی زبان بولتے ہوئے آئے۔ آپؐ نے اولاً ان ہی کو تبلیغ فرمائی، انہی کے اندر سے ایک امت تشکیل فرما دی۔ اس کے بعد پھر دوسری اقوام سے، دوسری نسلوں اور دوسرے ملکوں سے لوگ گویا تہہ در تہہ دائروں کی شکل میں اس امت میں شامل ہوتے چلے گئے۔ ایرانی آئے، تورانی آئے، ہندی آئے، بربر آئے، ایشیائی آئے، افریقی آئے۔ یہ سب "آخرین" میں شامل ہیں۔ تو حضور ﷺ کی بعثتیں دو ہوئیں : اولین بعثت اُمیین میں اور ثانوی بعثت آخرین میں۔

﴿ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ ﴾ کے الفاظ پر توجہ فرمایئے، یہاں "مِنْهُمْ" معنوی مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی جو بھی دائرہ اسلام میں آ جائے گا، چاہے وہ ہندی ہو، وہ مشرقِ بعید کا زرد رو انسان ہو، افریقہ کا سیاہ فام ہو، یورپ کا سرخ و سفید رنگت کا حامل ہو، یہ سب ملت کی وحدت میں گم ہوتے چلے جائیں گے، ایک ملت بنتی چلی جائے گی۔ اسی جانب اشارہ ہے "مِنْهُمْ" میں کہ یہ ایک ہی امت ہے، بعد میں آنے والے اسی امت کا جزو بنتے چلے جائیں گے۔ ﴿ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ﴾ کہ حضور کی بعثت ہوئی آخرین میں بھی جو ابھی ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے۔ ہو جائیں گے۔ ﴿ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾ اور وہ

(اللہ) العزیز ہے' الحکیم ہے"۔ اس آخری اور کامل نبوت و رسالت کے بارے میں اس کی حکمت تامہ کا یہ تقاضا ہوا کہ وہ آپؐ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمائے۔ وہ العزیز ہے' زبردست ہے' جو چاہے کرے' اور الحکیم ہے' اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ــــــ ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ "یہ اللہ کا فضل ہے' دیتا ہے جس کو چاہتا ہے"۔ ﴿ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ "اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے"۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

یہاں یہ اشارہ کر دیا گیا کہ یہ درجہ بدرجہ فضل کا معاملہ ہے۔ اللہ کا سب سے بڑھ کر فضل ہوا محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا : ﴿ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴾ کہ اے نبی (ﷺ) آپ پر اس کا بہت بڑا فضل ہوا۔ آپؐ کو وہ مقام و مرتبہ حاصل ہوگا جسے مقامِ محمود سے تعبیر فرمایا گیا ہے : ﴿ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ تو اولین اور بلند ترین فضیلت حاصل ہوئی محمد رسول اللہ ﷺ کو جو سیّد الاوّلین و الآخرین ہیں' سیّد الانبیاء ہیں' امام الرسل ہیں۔ پھر بقیہ نوعِ انسانی کے مقابلے میں ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہوا اُمّیین کو یعنی بنو اسماعیل کو ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!

اب یہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور دین ہے کہ اس نے عربوں کو چن لیا اور ان میں اپنا آخری نبی مبعوث فرمایا' ان کی زبان میں اللہ کا آخری کلام نازل ہوا' جو طور طریقے ان کے ہاں رائج تھے انہی میں قطع و برید کر کے آخری اور کامل شریعت کا تانا بانا تیار کیا گیا۔ یہ بات اس سے پہلے سورۃ الحج کے آخری رکوع میں ہم پڑھ آئے ہیں : ﴿ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ کسی غیر ابراہیمی نسل کے انسان کے لئے مغائرت کا کوئی معاملہ ہو سکتا ہے۔ زبان کا حجاب ایک بڑی رکاوٹ ہے' پھر نسلی اور موروثی عادات و خصائل کا معاملہ ہے جو منافرت کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن اے بنو اسماعیل! تمہارے لئے تو کوئی غیریت نہیں' کوئی اجنبیت نہیں' تمہارے جو موروثی مراسم تھے ان ہی میں سے اکثر و بیشتر کو معمولی سی قطع و برید کے بعد اس آخری شریعت کا جزء بنا لیا

گیا۔ یہ طواف تمہارے ہاں ہوتا چلا آرہا تھا‘ قربانی کی رسم تمہارے ہاں چلی آرہی تھی‘ منیٰ اور عرفات کا قیام کسی نہ کسی درجے میں تمہارے ہاں جاری تھا‘ تلبیہ تمہارے ہاں مروج تھا‘ اگرچہ اس میں تم نے اپنی طرف سے بعض شرکیہ کلمات شامل کرلئے تھے۔ گویا مجموعی طور پر وہ پورا ڈھانچہ (structure) موجود تھا جس میں ترمیم و اضافہ کرکے آخری شریعت کا تانا بانا تیار ہوا۔ تو یہ بلاشبہ ایک فضیلت کا مقام ہے جو انہیں حاصل ہوا۔ پھر درجہ بدرجہ یہ فضیلت حاصل ہے نوعِ انسانی کے ہر اُس فرد کو جو دامن محمدی سے وابستہ ہو جائے‘ جو ملت اسلامیہ میں شامل ہو جائے‘ جو اس امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام) میں شریک ہو جائے۔ ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○ ﴾

یہود کا ذکر ——— بطورِ نشانِ عبرت

اب اگلی آیت میں یہود کا تذکرہ ہے۔ اور یہ بات اس سے قبل "المُسبّحات" کے تعارف کے ضمن میں اصولاً بیان کی جاچکی ہے‘ جس کی ایک بڑی واضح اور نمایاں مثال سورۃ الصف میں ہمارے سامنے آچکی ہے‘ کہ ان سورتوں میں اگرچہ اصلاً خطاب امت مسلمہ سے ہے‘ لیکن سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کو بطور نشانِ عبرت مسلمانوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ہر سورت میں بنی اسرائیل یعنی یہود میں اعتقادی یا عملی گمراہیوں کا وہی پہلو زیر بحث آئے گا کہ جو اس سورت کے عمود سے متعلق ہو۔ جہاد و قتال کا مضمون سورۃ الصف میں مذکور تھا تو وہاں اس خاص پہلو سے ان کا جو معاملہ رہا اور قتال فی سبیل اللہ سے انکار کرکے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس شدید ذہنی اذیت سے دوچار کیا‘ اسے نمایاں کیا گیا کہ مسلمانو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اس روش کو اختیار کرلو! اب غور کیجئے کہ یہاں سورۃ الجمعہ میں ساری گفتگو قرآن مجید کے گرد گھوم رہی ہے۔ واضح کردیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن حکیم ہے‘ مزید یہ کہ حضور ﷺ صرف اُمیین کے لئے رسول ہو کر نہیں آئے پوری نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

کتاب اللہ کا وارث کون؟

یہی وجہ ہے کہ سیرتِ طیبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اسی قرآن کے ذریعے انزار و تبشیر کا فریضہ سرانجام دیا‘ اسی کے ذریعے تذکیر فرمائی‘ اور اسی کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں اُمیین میں سے ایک امت تیار فرمادی‘ اسے تربیت و تزکیہ کے مراحل سے گزارا‘ اسے نہ صرف یہ کہ کتاب و شریعت کی تعلیم دی بلکہ کتاب کا ایک بھرپور عملی نمونہ اس کے سامنے پیش کر کے دکھادیا‘ اور پھر حجۃ الوداع کے موقع پر امت سے یہ گواہی لینے کے بعد کہ : ”اِنَّا نَشْهَدُ انَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّيْتَ وَ نَصَحْتَ“ (اے نبی ﷺ! ہم گواہ ہیں کہ آپ نے تبلیغ کا حق ادا کردیا‘ اللہ کی امانت درست طور پر پہنچادی اور نصح و خیر خواہی کا حق ادا کردیا۔) خطبے کے آخر میں فرمایا : ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) کہ جو یہاں موجود ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پیغامِ حق کو پہنچائیں ان تک کہ جو یہاں موجود نہیں۔ غور کیجئے‘ یہی واحد لائحہ عمل ممکن تھا‘ اس کے سوا کوئی صورتِ حال قابل عمل نہیں تھی‘ اس لئے کہ حضور ﷺ اگر پوری نوعِ انسانی کے لئے رسول ہیں‘ اور بلاشک و شبہ ہیں‘ تو یا تو یہ صورت ہوتی کہ آپؐ کی حیاتِ دُنیوی قیامت تک دراز کردی جاتی تاکہ آپؐ اپنے فرائض رسالت خود بنفس نفیس ادا فرماتے رہتے‘ پھر جو کوئی آپؐ کا ساتھی بنتا وہ دعوت و تبلیغ کے کام میں آپؐ کا دست و بازو بنتا جاتا‘ جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپؐ کے ساتھ دین کی راہ میں تعاون کیا‘ آپؐ کی نصرت کی‘ آپؐ کے اعوان و انصار بنے‘ آپ کے مشن کی تکمیل کے لئے اپنی جانیں دیں اور اپنی جان اور مال اس راہ میں کھپایا۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً تبلیغ دین کا کام قیامت تک براہِ راست نبی اکرم ﷺ ہی کی زیر سرکردگی جاری رہتا۔ لیکن جب نبی اکرم ﷺ کا وصال ہوگیا تو اب ایک ہی راستہ ممکن تھا کہ وہ امت جو آپؐ نے تیار فرمادی‘ اللہ کا پیغام نوعِ انسانی تک پہنچانے کی ذمہ دار بنے‘ وہ اسی قرآن کو ہاتھ میں لے کر نکلے اور اس کی ہدایت تامہ سے پورے روئے ارضی کو منور کرے‘ قرآن کی تعلیمات کو عام کرے اور اس کی تبلیغ کا فریضہ ادا کرے‘ بلکہ اس کا حق ادا کردے۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں!

اسی حوالے سے خطبہ حجۃ الوداع کا ایک اور جملہ بھی ذہن میں تازہ کرلیجئے۔ حضور

ﷺ نے فرمایا : ((قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا' کِتَابَ اللّٰہِ)) "لوگو! میں چھوڑ کر جا رہا ہوں تمہارے مابین وہ چیز کہ اگر تم نے اس کو تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' اور وہ ہے اللہ کی کتاب!" ـــــ غور کیجئے کہ یہاں "اعتصام" کا لفظ آیا ہے۔ اس کا تعلق جوڑ لیجئے سورۃ الحج کے درس کے ساتھ۔ وہاں ﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ﴾ کے الفاظ وارد ہوئے تھے اور میں نے عرض کیا تھا کہ اعتصام باللہ کی قدرے وضاحت سورۂ آلِ عمران میں آئی ہے : ﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ... ﴾ اس کی مزید وضاحت کے لئے میں نے قرآن مجید کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا یہ قول سنایا تھا کہ : ((ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) (یہ قرآن ہے اللہ کی مضبوط رسی)۔ یہاں خطبہ حجۃ الوداع میں یہی بات آئی کہ ((قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ . . .)) کہ اے مسلمانو' میں تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں وہ کتاب کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہ ہو گے ـــــ تو جان لیجئے کہ انبیاء کے بعد ان کی امتیں کتاب کی وارث ہوا کرتی ہیں' چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے وصال فرمانے کے بعد اب یہ امت کتاب اللہ کی وارث ہے۔ وراثت کتاب کا مضمون سورۃ الشوریٰ میں بایں الفاظ آیا ہے : ﴿ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ۝ ﴾ ایک شکوے کے سے انداز میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ وہ لوگ یا وہ امتیں جو نبیوں کے بعد ان کی کتابوں کی وارث بنتی ہیں وہ اس کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ کتاب کے وارث ہونے کے ناطے امت کا فرضِ منصبی یہ بنتا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کو ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑی ہو اور اس کے نورِ ہدایت سے چہار دانگ عالم کو منور کر دے۔ اے مسلمانو! اگر تم یہ فرضِ منصبی ادا نہیں کرو گے تو جان لو کہ پھر تمہارا طرزِ عمل وہ ہو گا جو اس سے پہلے یہود اختیار کر چکے ہیں' اور جس کی پاداش میں انہیں مغضوب علیہم قرار دیا جا چکا ہے ـــــ یہاں وہ ربط اب معین ہو گیا۔ اگلی آیات کے مضامین کا اس سورت کے مرکزی مضمون کے ساتھ در حقیقت یہی ربط ہے۔

تو راۃ کے ساتھ یہود کا طرزِ عمل ـــــ ایک عبرت ناک مثال

فرمایا :

﴿ مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ

اَسۡفَارًا ؕ بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ○ ﴾

کہ تم سے پہلے بھی ایک امت حامل کتاب بنائی گئی تھی' تورات جیسی نعمت اسے عطا ہوئی تھی۔ حامل کا لفظ "حَمَلَ یَحۡمِلُ" سے اسم فاعل ہے۔ اس کا مفہوم ہے "بوجھ اٹھانے والا"۔ اسی طرح "حَمَّالٌ" کہتے ہیں بوجھ اٹھا کر لے جانے والے کو۔ عربی زبان میں یہ لفظ عام طور پر مزدور کے لئے مستعمل ہے' یعنی وہ شخص جس کا کام ہی یہ ہے کہ بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرے۔ گویا حامل کتاب الٰہی اُس قوم کو کہا جائے گا جس کے ذمے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کو دوسروں تک پہنچائے' اسے پھیلائے' اس کی ہدایت کو عام کرے۔ یہ کتاب رسول ﷺ کے ذریعے تم تک پہنچی ہے' اب اس کو پوری نوعِ انسانی تک پہنچانا تمہارے ذمے ہے۔ لیکن یہود نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا : ﴿ مَثَلُ الَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىۃَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡھَا ﴾ "مثال ان لوگوں کی جو حامل تورات بنائے گئے (جو اٹھوائے گئے تورات)' پھر انہوں نے اسے نہ اٹھایا (اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا) ﴿ کَمَثَلِ الۡحِمَارِ یَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ﴾ "اس گدھے کی سی (مثال) ہے جو اٹھائے ہوئے ہو کتابوں کا بوجھ!" یہاں یہود کو اُس گدھے کے مثل قرار دیا گیا ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔

عربی زبان میں سِفر اور سَفر دونوں کی جمع اَسفار آتی ہے۔ سِفر کے معنی ہیں کتاب۔ چنانچہ تورات میں شامل کتابوں (یا ابواب) کے لئے یہی لفظ مستعمل ہے' مثلاً سِفرِ پیدائش' سِفرِ تقویم (The Book of Genesis) وغیرہ۔ اس اعتبار سے یہاں آیت زیر نظر میں "اَسفار" کا لفظ اپنے اندر بڑی معنویت لئے ہوئے ہے۔

﴿ کَمَثَلِ الۡحِمَارِ یَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ﴾ یہ تمثیل بھی نہایت بلیغ ہے۔ گدھے کی پیٹھ پر مکالماتِ فلاطوں کی سو جلدوں کی گٹھڑی باندھ کر رکھ دیجئے' اس سے اس کے اندر نہ تو کوئی فلسفیانہ بصیرت پیدا ہوگی اور نہ ہی حکمت اور دانائی کی کوئی بات اسے حاصل ہوگی۔ یہ مثال ہے اُس قوم کی جو کتابِ الٰہی کی حامل بنائی جائے اور پھر وہ اس کا حق ادا نہ کرے' اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے! اگرچہ یہ تمثیل ایک بار تو انسان کو چونکا دیتی ہے کہ

توراۃ کی حامل امت کے لئے گدھے کی مثال! لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی نمی شے کے اندر شناعت اور گراوٹ کا جو پہلو موجود ہوتا ہے اسے واضح کرنے کے لئے کوئی ایسی تمثیل مؤثر ہوتی ہے جس سے طبیعت میں ایک دفعہ لرزش سی پیدا ہو جائے۔ فصاحت اور بلاغت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

تکذیب حالی

آگے فرمایا : ﴿ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ ”بُری ہے مثال اُس قوم کی جنہوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا“ ـــــ یہاں لفظ ”تکذیب“ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تکذیب قول سے بھی ہو سکتی ہے اور عمل سے بھی۔ یعنی تکذیب باللسان بھی ہو سکتی ہے اور بالحال بھی۔ یہ بھی تکذیب ہی کی ایک صورت ہوتی اگر بنی اسرائیل زبان سے صاف کہہ دیتے کہ تورات اللہ کی کتاب نہیں ہے' لیکن تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے اس معنی میں توراۃ کی تکذیب کبھی نہیں کی۔ ہاں تکذیب عملی کے وہ ضرور مرتکب ہوئے۔ وہ تکذیب عملی کہ جس کا نقشہ بدقسمتی سے آج امت مسلمہ پیش کر رہی ہے کہ بجائے قرآن کو اپنا پیشوا' رہنما اور مشعل راہ بنانے کے امت کی عظیم اکثریت نے اسے طاقِ نسیاں پر رکھ چھوڑا ہے۔ قرآن نے اس طرزِ عمل کو تکذیب کے لفظ سے موسوم کیا ہے : ﴿ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ یہ اللہ کی آیات کی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے! زبان سے چاہے قرآن مجید پر کتنا ہی ایمان کا دعویٰ کیا جائے' اگر قرآن مجید کو ہم نے اپنا امام نہیں بنایا' قرآن مجید کی رہنمائی کو عملاً اختیار نہیں کیا' قرآن مجید کے عطا کردہ ضابطے اور قانون کو نافذ نہیں کیا' اس کی تعلیمات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو استوار نہیں کیا تو گویا کہ اپنے عمل سے ہم قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں۔ یہ تکذیب حالی ہے۔

امت مسلمہ کے لئے ایک پیشگی تنبیہہ

اب آیئے آیت کے آخری ٹکڑے کی طرف : ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ ”اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ نوٹ کیجئے' یہ وہی انداز ہے

جو سورۃ الصف میں آ چکا ہے۔ وہاں ظالم کی بجائے فاسق کا لفظ تھا : ﴿ وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ○ ﴾ اسلوب اور اسٹائل بعینہٖ وہی ہے۔ یہ چیز اُن مشترک اوصاف میں سے ہے جو جڑواں سورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ بہرحال اس آیۂ مبارکہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی کہ کتابِ الٰہی کے حامل ہونے کے ناطے ہر اُمت اور ہر قوم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' اگر اُن ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے تو درحقیقت یہ طرزِ عمل تکذیب کتاب کے مترادف ہے۔ یہ ایک پیشگی تنبیہہ تھی امت مسلمہ کو کہ اے مسلمانو! کہیں یہی معاملہ تم کتاب اللہ کے ساتھ نہ کر بیٹھنا! یہی وہ بات ہے جو حضور اکرم ﷺ کے ایک نہایت جامع فرمان میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ فرمایا : ((یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ)) "اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ نہ بنالینا"۔ وسادہ کہتے ہیں تکیے کو۔ یہ جملہ دو مفہوم دے رہا ہے (۱) تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے' اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا۔ اور (۲) تکیے پر انسان سہارا لیتا ہے۔ اور ایک سہارا ذہنی اور نفسیاتی بھی ہوتا ہے۔ اس پہلو سے مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کو اس طرح کا ذہنی اور نفسیاتی سہارا نہ بنا بیٹھنا کہ ہم تو حامل کتاب ہیں' قرآن کے وارث ہیں' محمد ﷺ کے امتی ہیں۔ اس طرح کا ذہنی سہارا بسا اوقات بے عملی کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ روک دیا گیا کہ قرآن کو اس نوع کا ایک ذہنی سہارا نہ بنا لینا' بلکہ تمہاری اصل توجہ اس جانب ہونی چاہئے کہ قرآن کے حوالے سے ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' قرآن کے ساتھ ہمارا عملی رویہ کیا ہونا چاہئے' اور یہ کہ قرآن مجید کے وہ کون کون سے حقوق ہیں جن کی ادائیگی کی فکر ہر مسلمان کو کرنی ہے اور ان کی ادائیگی کی عملی صورت کیا ہے؟

قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں

نبی اکرم ﷺ کی جس حدیث شریف کا ابھی ذکر ہوا تھا اس میں اس پیشگی تنبیہہ کے بعد کہ ((یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) "اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ اور ذہنی سہارا نہ بنالینا" آپؐ نے بڑی جامعیت کے ساتھ ان اساسات کو واضح فرمایا' کہ جن پر قرآن حکیم کے ساتھ اُمت مسلمہ کے صحیح تعلق کا دار و مدار ہے' اور جن کی بجا آوری کی

امت کو فکر کرنی چاہیے۔ فرمایا: ((وَ اتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ فِیْ اٰنَاءِ اللَّیْلِ وَ النَّهَارِ)) "اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی"۔ "وَ تَغَنَّوْهُ" "اور اسے خوش الحانی سے پڑھا کرو!" اس لئے کہ ہر انسان کو کسی نہ کسی درجے میں حسن سماعت سے بھی حصہ ملتا ہے۔ بندۂ مؤمن کے لئے اپنی فطرت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ اچھی سے اچھی آواز میں اور بہتر سے بہتر انداز میں قرآن مجید کو پڑھے اور اس سے حظ حاصل کرے۔

آگے فرمایا: ((وَ افْشُوْهُ)) "اور اسے پھیلاؤ"۔ اسے عام کرو! حضرت مسیح علیہ السلام نے بڑی پیاری بات فرمائی تھی کہ چراغ جلا کر اسے کہیں نیچے نہیں رکھا کرتے' بلکہ بلند مقام پر رکھتے ہیں تاکہ اس کی روشنی عام ہو۔ یہ نورِ ہدایت' قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لئے نازل ہوا ہے۔ جس کا نقشہ کھینچا گیا اس شعر میں ؂

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

بھٹکتے ہوئے قافلہ انسانیت کے لئے قندیل ہدایت یہی قرآن ہے۔ اس کو پھیلانے اور عام کرنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی۔ اسی کی جانب اشارہ فرمایا آپؐ نے اپنے آخری خطبے میں: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) "کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہیے کہ اس پیغام کو پہنچائیں ان تک جو یہاں موجود نہیں"۔ اور اس بات کو منطقی انتہا تک آپؐ نے پہنچا دیا اپنے اس قولِ مبارک کے ذریعے کہ: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَ لَوْ اٰيَةً)) "پہنچاؤ میری جانب سے' خواہ ایک ہی آیت ہو"۔ چراغ سے چراغ اسی طور سے روشن ہو گا۔ اس ضمن میں آپؐ کا یہ ارشاد بھی نہایت اہم ہے: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهٗ)) "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے" جو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں اور متفق علیہ روایت ہے۔ یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: ((وَ تَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)) "اس پر غور و فکر کرو (اس کے مفاہیم و معنی کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرو) تاکہ تم فلاح اور

کامیابی سے ہمکنار ہو سکو!"

اسی سلسلے میں ایک اور حدیث بھی جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں' انتہائی توجہ کے لائق ہے۔ حضور ﷺ قرآن کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ((وَ لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ)) "اور یہ کتاب وہ ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے" ((وَ لَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ)) "اور اہل علم اس سے کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے" ((وَ لَا یَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ)) "بار بار کے پڑھنے کے باوجود (اس سے طبیعت اکتائے گی نہیں) اس پر پرانے پن کا کوئی احساس کبھی پیدا نہ ہونے پائے گا" —— یہ ہے اللہ کی کتاب' جس کے حقوق کی ادائیگی کی ہم سب کو فکر ہونی چاہئے۔

اس موضوع پر اللہ کے فضل و کرم سے مَیں نے کسی زمانے میں مسجد خضریٰ لاہور میں دو تقریریں کی تھیں جو اَب ایک کتابچے کی شکل میں موجود ہیں' جس کا عنوان ہے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" یہ کتابچہ یوں سمجھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث ہی کی وضاحت پر مشتمل ہے کہ "اے مسلمانو! حامل قرآن ہونے کے اعتبار سے پہچانو کہ تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں' تمہارے فرائض کیا ہیں! اس کو مانو جیسا کہ ماننے کا حق ہے' اسے پڑھو جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے' اس کو سمجھو جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے' اس پر عمل کرو جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے' اور آخری ذمہ داری یہ کہ اس کو پھیلاؤ' اس کی تبلیغ و تبیین کرو جیسا کہ اس کی تبلیغ کا حق ہے"۔ چہار دانگ عالم کو اس کے نور سے منور کرنے کے لئے اپنی بہترین صلاحیتیں خرچ کرنا اور کھپانا ہر مسلمان پر اس کتاب عزیز کا وہ حق ہے جسے ہم فراموش کئے ہوئے ہیں۔
حضور ﷺ کی بعثت چونکہ ((اِلٰی کَآفَّةِ النَّاسِ)) تھی' یعنی آپؐ تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں' لہٰذا حضور ﷺ نے تبلیغ و تعلیم قرآن کے ذریعے ایک مخصوص خطہ زمین میں ایک انقلابِ عظیم برپا فرما دیا اور وہاں بسنے والی قوم کو وہ نسخہ کیمیا قرآن مجید عطا فرما کر آپؐ اس دُنیا سے تشریف لے گئے۔ اب اُمت کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ وہ اس چراغ کو لے کر نکلے اور اس کے نور سے روئے ارضی کو منور کر دے ۔

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

ذہن میں رکھئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے اس فرضِ منصبی کا پورا شعور حاصل تھا۔ چنانچہ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا تو دوسرے میں تلوار! ـــــ حقیقت یہ ہے کہ ایک مردِ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولا انسان کے تصور میں اُبھرتا ہے اس میں لازماً یہ بات شامل ہوتی ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہے اور دوسرے میں تلوار۔ ایک طرف قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اس کے نورِ ہدایت کو عام کرنا اور دوسری جانب اللہ کے دین کے غلبے کے لئے اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں سے جہاد اور قتال' یہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا نقشہ!

قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل

یہ ہے وہ کام کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے سپرد فرما کر گئے تھے۔ اس سلسلے میں پیشگی تنبیہ سورۃ الجمعہ میں کر دی گئی کہ دیکھنا کہیں اس کے بر عکس تمہارا طرزِ عمل یہود کا سا نہ ہو جائے' جنہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ وفاداری نہیں کی تو اللہ نے انہیں اس گدھے کے مشابہ قرار دیا جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔

﴿ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾

"نہایت بری مثال ہے اس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا' اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

یہ بات دوسری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قولِ مبارک ہمارے حق میں پورا ہوا ہے کہ ((لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) اور ہم بعینہٖ یہود کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں' چنانچہ قرآن کے ساتھ ہمارا تعلق بس اشارہ گیا ہے کہ ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست   کہ از یاسینِ اُو آساں بمیری

قرآن ہمارے نزدیک محض ایصالِ ثواب یا حصولِ ثواب کا ایک ذریعہ ہے یا موت کو آسان کرنے کا ایک نسخہ کہ مرتے ہوئے سورۂ یٰسین سنا دی جائے تاکہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔ ہماری عملی زندگی کا قرآن حکیم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ ہماری رہنما کتاب ہے' نہ یہ ہماری امام ہے' نہ یہ قولِ فیصل ہے کہ ہمارے تمام فیصلے اسی پر مبنی

ہوں' نہ اس پر ہماری زندگی کا نظام استوار ہے۔ تو گویا بعینہٖ وہ بات کہ جو یہود کو نشانِ عبرت کے طور پر پیش کر کے ہمیں بطور تنبیہہ کہی گئی تھی ہماری بد بختی اور بد قسمتی کہ ہم پر صادق آ رہی ہے اور ہم اس وقت اپنی موجودہ صورتِ حال سے اس کا ایک مکمل نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

اگلی آیات میں یہ حقیقت کھولی گئی ہے کہ کسی مسلمان اُمت میں زوال اور گمراہی کا پیدا ہو جانا کن اسباب سے ہوتا ہے! بڑی جامعیت کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا گیا آیت ۶ میں:

﴿ قُلْ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ ﴾

"(اے نبیؐ) کہئے: اے یہودیو! اگر تمہیں یہ زعم ہے (اگر تمہیں یہ خیالِ خام لاحق ہو گیا ہے) کہ تم اللہ کے بڑے دوست ہو (اس کے چہیتے اور محبوب ہو) لوگوں کو چھوڑ کر' تو اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو!"

دوست سے ملاقات کی آرزو ہر شخص کو ہوتی ہے' اس سے دوری تو انسان پر شاق گزرتی ہے۔

عملی اضمحلال کا اصل سبب

یہاں اشارہ ہوا اس بات کی طرف کہ کسی مسلمان اُمت میں عملی گمراہی اور اضمحلال کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہنوں میں بالعموم یہ خیالِ خام راسخ ہو جاتا ہے کہ ہم بخشے بخشائے ہیں' ہم اللہ کے چہیتے ہیں: ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ ہم اللہ کے برگزیدہ بندوں کی اولاد اور اس کے پسندیدہ بندوں کے ساتھ نسبت اور تعلق رکھنے والے لوگ ہیں' جہنم کی آگ ہمارے لئے نہیں کسی اور کے لئے ہے۔ اس زعم اور بے بنیاد خیال کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں تساہل اور عملی زوال شروع ہو جاتا ہے۔ پھر انسان اپنی نجات کے معاملے کو عمل کرنے کی بجائے ان تعلقوں اور نسبتوں پر موقوف سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں جھنجھوڑنے کے لئے ایک بڑی ہی عملی مثال سامنے لائی گئی کہ اگر تمہیں فی الواقع یہ خیال ہے کہ تمہیں خدا سے محبّت ہے تو

اس سے جلد سے جلد ملاقات کا جذبہ اور شوق تمہارے دل میں موجزن ہونا چاہئے۔ وہ جس کا نقشہ کھینچا علامہ اقبال نے ان الفاظ میں ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

اپنے گریبان میں جھانکو' کیا واقعی یہ کیفیت ہے؟ کیا واقعی یہ زندگی تم پر اسی طرح بھاری گزر رہی ہے جیسے کہ حضور ﷺ نے نقشہ کھینچا تھا کہ :((اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّةُ الْكَافِرِ)) "یہ دُنیا ایک بندۂ مؤمن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے گلستان"۔ یا معاملہ اس کے برعکس ہے' اور دُنیا سے محبّت کی کیفیت وہ ہے جو سورۃ البقرۃ میں یہود کی بیان ہوئی :

﴿ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ ﴾ (البقرة : ۹۶)

کہ ان میں سے ہر ایک کی بڑی خواہش ہے کہ زندگی طویل ہو جائے' ایک ہزار برس تک وہ اس دُنیا میں جی سکیں اور یہاں کا لطف اٹھا سکیں' ان کی اصل کیفیاتِ باطنی تو یہ ہیں' دعویٰ کر رہے ہیں خدا کی محبّت کا اور خدا کے محبوب ہونے کا۔

یہ ہے وہ پریکٹیکل ٹیسٹ جو اُن کے سامنے رکھ دیا گیا کہ اس پر اپنے آپ کو پرکھو۔ آیت کے اگلے ٹکڑے میں ارشاد ہوتا ہے :

﴿ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ﴾

"اور یہ ہرگز ہرگز تمنا نہیں کر سکتے موت کی' بسبب اس کمائی کے جو اُن کے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہوئی ہے"۔

سورۃ القیامہ میں ہم پڑھ آئے ہیں :﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ ﴾ کہ انسان کو خوب معلوم ہوتا کہ وہ کہاں کھڑا ہے' کتنے پانی میں ہے۔ ﴿ وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝ ﴾ خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں اور کتنے ہی بہانے تراش لے اور خواہ وہ اپنی استدلالی قوّت سے اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند کرادے' لیکن اس سب کے باوجود اس کا ضمیر اسے بتا رہا ہوتا ہے کہ تم حقیقت میں کیا ہو ـــــ چنانچہ صاف فرمادیا کہ یہ یہود اگرچہ خود کو اللہ کا لاڈلا اور چہیتا قرار دیتے ہیں' لیکن جو کچھ یہ اپنے ہاتھوں سے آگے بھیج چکے ہیں' جو کمائی

انہوں نے کی ہے آخرت کے نقطۂ نگاہ سے' اس کے پیشِ نظر یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کر سکتے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ "اور اللہ ظالموں سے بخوبی باخبر ہے"۔

اگلی آیت میں یہ مضمون اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ﴾ کہ (اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجئے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو' جس سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہو وہ تم سے ملاقات کر کے رہے گی۔ کتنا ہی بھاگو' کتنا ہی اس سے پہلو بچانے کی کوشش کرو' وہ سامنے آن کھڑی ہو گی۔ ﴿ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ پھر تمہیں لوٹا دیا جائے گا اس ہستی کی طرف کہ جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے ﴿ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ پھر وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ان آیات میں خطاب اگرچہ یہود سے ہے' لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا تھا ان سورتوں میں اصل تخاطب اُمت مسلمہ سے ہے' ساری بات مسلمانوں سے ہو رہی ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اصل میں اُمت مسلمہ کو گویا پیشگی طور پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے اندر اگر عملی اضمحلال آئے گا' اپنے دینی مطالبات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے تم اگر پہلو تہی کرو گے تو اس کا اصل سبب یہ ہو گا کہ تمہیں یہ زعم لاحق ہو جائے گا کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں' ہم اس کے محبوبوں کی اولاد میں سے ہیں یا ہم اس کے محبوبوں اور اس کے مقربین بارگاہ کے دامن سے وابستہ لوگوں میں سے ہیں۔ یہ زعم ہے جو تمہیں عمل سے دور کرتا چلا جائے گا اور اس کا ایک نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم دُنیا پرستی میں غرق ہوتے چلے جاؤ گے۔ دُنیا ہی تمہارا مطلوب و مقصود بنتی چلی جائے گی اور دوسرے یہ کہ موت کا خوف رفتہ رفتہ تم پر مسلط ہو جائے گا۔

ایک چونکا دینے والی حدیث

نبی اکرم ﷺ نے خبر دی تھی کہ اے مسلمانو! ایک وقت آئے گا کہ دُنیا کی قومیں تم پر

ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے دعوت کا اہتمام کرنے والا کوئی شخص دسترخوان کے چنے جانے کے بعد مہمانوں سے کہتا ہے کہ آیئے تشریف لائے' کھانا تناول فرمایئے! اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حیران ہو کر پوچھا کہ مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ حضور! کیا اس زمانے میں ہماری تعداد بہت کم رہ جائے گی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! ((بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ)) تعداد تو تمہاری بہت ہوگی' نوے کروڑ' ایک ارب اور نامعلوم کتنی! لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہوگی کہ جیسے کسی جگہ اگر سیلاب آجائے تو سیلاب میں پانی کے ریلے کے اوپر کچھ جھاڑ جھنکار ہوتا ہے' کچھ جھاگ ہوتا ہے ((وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ)) اس سے زائد تمہاری حیثیت نہیں ہوگی' دُنیا میں تمہاری اہمیت اس سے بڑھ کر نہ رہے گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر سوال کیا کہ حضور! ایسا کیوں ہو جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا: تمہارے اندر ایک بیماری پیدا ہو جائے گی جس کا نام "وھن" ہے۔ سوال کیا گیا: "مَا الْوَهْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" کہ حضورؐ! وہ وہن کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ)) دُنیا کی محبت اور موت سے نفرت —— یہ بیماری جب تم میں پیدا ہو جائے گی' جب دُنیا تمہاری محبت کا مرکز بن جائے گی اور موت سے تم دُور بھاگنے لگو گے تو بہت بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود تم اقوامِ عالم کے لئے لقمۂ تر بن جاؤ گے —— لیکن ظاہر بات ہے کہ کوئی اپنی درازیٔ عمر کے باعث اللہ کی پکڑ سے بہرحال بچ نہیں سکے گا' اسے بالآخر اپنے ربّ کی طرف لوٹنا ہی ہوگا اور وہاں اس کا حساب چکا دیا جائے گا۔

یہاں اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ مکمل ہوا جو چار آیات پر مشتمل ہے۔ ان میں ذکر اگرچہ سابقہ اُمتِ مسلمہ یہود کا ہے' لیکن اصلاً یہ ایک آئینہ ہے کہ جس میں نئی اُمتِ مسلمہ کو آئندہ کی تصویر دکھائی جا رہی ہے کہ جیسے وہ حاملِ کتاب بنائے گئے تھے اس طرح تم بھی حاملِ قرآن بنائے جا رہے ہو' جیسے وہ وارثِ کتاب بنے تھے ویسے ہی تم بھی وارثِ کتاب بنائے گئے ہو' دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ جو معاملہ انہوں نے کیا تھا تم بھی قرآن کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگو!! یہ ہے درحقیقت اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے اور دوسرے حصے کے مضامین کے مابین ربط و تعلق۔ چونکہ انقلابِ محمدیؐ کا آلہ قرآن حکیم ہے اور حضور ﷺ کی بعثت قیامت تک آنے والی پوری نوعِ انسانی کے لئے

ہے' لہٰذا جس عمل کو حضور ﷺ نے جاری رکھا ﴿ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ﴾ اور جس کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر انقلاب جزیرہ نمائے عرب میں برپا کر دیا' اسی عمل کو جاری رکھنا اور آگے چلانا اُمت کی ذمہ داری ہے۔

اس کے لئے اساسی منہاج وہی ہو گا جو حضور اکرم ﷺ نے اختیار کیا' جس میں مرکز و محور کی حیثیت قرآن حکیم کو حاصل تھی۔ یہاں سورۃ الجمعہ کا پہلا رکوع ختم ہوا۔

حکمت و احکامِ جمعہ

سورۃ الجمعہ کا دوسرا رکوع تین آیات پر مشتمل ہے اور اس میں حکمت و احکامِ جمعہ کا بیان ہے۔ یہاں ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے مرکزی مضمون اور عمود کے ساتھ نظامِ جمعہ کا کیا تعلق ہے۔ اس لئے کہ بظاہر تو معاملہ غیر متعلق سا نظر آتا ہے! —— تاہم پہلے ان آیات کا ایک رواں ترجمہ کر لینا مفید ہو گا۔ فرمایا :

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ ﴾

"اے اہل ایمان! جب تمہیں پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو لپکو اللہ کی یاد کی طرف اور کاروبار چھوڑ دو! یہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھو!"

ذہن میں تازہ کیجئے' سورۃ الصف کا دوسرا رکوع بھی شروع ہوا تھا ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے الفاظ سے اور اس میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے تھے کہ ﴿ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ ﴾ یہ مشابہت لفظی بھی بہت قابلِ توجہ ہے۔ آگے ارشاد ہوتا ہے :

﴿ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَیْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآىٕمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ○ ﴾

"جب نماز ادا کی جا چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو' اور اللہ کا ذکر جاری رکھو کثرت کے ساتھ' تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (اب ایک متعین واقعے

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) جب انہوں نے دیکھا کوئی کاروبار یا کوئی اور دلچسپی کی چیز تو وہ اس کی طرف لپک گئے اور چھوڑ گئے آپ کو (اے نبیؐ) کھڑے ہوئے۔ کہہ دیجئے جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے تجارت سے بھی اور دلچسپیوں کی چیزوں (لہو و لعب) سے بھی' اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔"

ان تین آیات میں' جیسا کہ ترجمے سے واضح ہو گیا' ساری بات نمازِ جمعہ اور خطبۂ جمعہ کی ہو رہی ہے۔ جمعہ کی فرضیت اس درجے واضح کی گئی کہ صریحاً فرما دیا گیا کہ جب جمعہ کی اذان ہو جائے تو ہر نوع کا کاروبارِ دنیوی ترک کر دیا جائے' ہمہ تن متوجہ ہو جایا جائے! یہ ساری باتیں جو آ رہی ہیں تو پہلے جیسا کہ عرض کیا گیا تھا یہ سمجھئے کہ اس کا ربط کیا ہے۔

رہ گئی رسم اذاں....

درحقیقت یہ نظامِ جمعہ جس کو ہم نے ایک رسم بنا لیا' ایک نہایت عظیم اور مبنی بر حکمت نظام ہے۔ اس معاملے میں تو شاید مسلمانوں کو دنیا کی کوئی قوم بھی مات نہ دے سکے کہ بڑی سے بڑی چیز کو ایک رسم بنا کر رکھ دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے —— نتیجہ یہ ہے کہ اعمال کی محض صورت اور شکل باقی رہ جاتی ہے اور اس کی روح غائب! یہ بات نظروں کے سامنے رہتی ہی نہیں کہ وہ عمل کس لئے تھا' اس کا مقصد کیا تھا؟ بس عمل کی ظاہری صورت باقی رہتی ہے اور اس کی حیثیت ایک رسم (Ritual) سے زیادہ نہیں ہوتی۔

رہ گئی رسم اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

اسی طرح کا معاملہ اجتماعِ جمعہ کا ہے۔ آج اس گئے گزرے دور میں بھی مسلمانوں میں ابھی کثیر تعداد میں وہ لوگ موجود ہیں جو جمعہ کے لئے بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آتے ہیں' نہا دھو کر' اچھے صاف ستھرے کپڑے پہن کر' خوشبو لگا کر آتے ہیں' لیکن یہ بات بالعموم پیشِ نظر نہیں ہوتی کہ اس نظامِ جمعہ کا اور اس سب اہتمام کا حاصل کیا ہے' اس کی غرض و غایت کیا ہے' اس کی حکمت کیا ہے! —— اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس جمعہ کی اصل اہمیت خطبہ جمعہ کی وجہ سے ہے' ورنہ جمعہ کی نماز میں فرض رکعتوں کی تعداد نمازِ ظہر

سے بھی نصف رہ جاتی ہے جس کا کہ وہ قائم مقام بنتی ہے۔ نماز ظہر کی چار رکعتیں ہیں جب کہ نماز جمعہ میں کل دو رکعات فرض شامل ہیں۔ گویا نماز کی رکعتوں کی تعداد کم ہو گئی۔ جمعہ کو جس چیز نے "جمعہ" بنایا ہے وہ خطبہ جمعہ ہے' اور خطبہ جمعہ کی غرض و غایت کیا ہے' اسے مسلم شریف کی ایک روایت کے حوالے سے سمجھئے کہ حضور ﷺ خطبہ جمعہ میں کیا کیا کرتے تھے؟ ــــ "كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ وَيُذَكِّرُ النَّاسَ" ــــ "آپ ﷺ قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور لوگوں کو تذکیر فرماتے تھے" یاد دہانی کیا کرتے تھے۔ یہ تذکیر بالقرآن وہی ہے جس کا ذکر سورۂ قٓ کی آخری آیت میں آیا ہے: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ یعنی "اے نبی! اس قرآن کے ذریعے سے تذکیر فرمائیے (اور یاد دہانی کراتے رہئے) ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔"

حکمت جمعہ

خطبہ جمعہ دراصل عوامی سطح پر تذکیر بالقرآن ہی کی ایک ہمہ گیر شکل ہے۔ یہ گویا تعلیم بالغان کا ایک عظیم نظام ہے جو امت میں رائج کیا گیا کہ کوئی نائب رسول منبر رسولؐ پر کھڑا ہو اور قرآن حکیم کی آیات کے ذریعے تذکیر و نصیحت کا وہی فریضہ سرانجام دے جو درحقیقت انقلاب محمد ﷺ کی جڑ اور بنیاد ہی نہیں' مرکز و محور بھی ہے۔ یعنی ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اسی نبوی عمل کو دوام بخشا گیا اور اسے امت کے اندر ایک مستقل عمل کی حیثیت سے جاری کر دیا گیا نظامِ جمعہ کی صورت میں' کہ لوگ خطبہ سننے کے لئے پورے اہتمام سے نہا دھو کر آئیں' اعصاب چاق و چوبند ہوں' ماحول معطر ہو۔ غور کیجئے' یہ ساری ہدایات کیوں دی گئیں! نبی اکرم ﷺ نے اس معاملے میں یہاں تک فرمایا کہ کیا تمہارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اپنے ان کپڑوں کو جو محنت مزدوری کے وقت پہنتے ہو' علیحدہ رکھو اور جمعہ کے لئے ایک صاف ستھرا جوڑا علیحدہ تیار رکھو؟ تاکہ جب مسلمان جمع ہوں تو وہاں کا ماحول پسینے کی بدبو سے منغض نہ ہو بلکہ پاک صاف اور معطر ماحول ہو کہ مسلمان خطبہ جمعہ پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ سن سکیں اور کوئی نائب رسول جب عمل نبویؐ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے آیات قرآنی کے ذریعے سے وعظ و نصیحت کرے تو ان باتوں کو سننے اور سمجھنے کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکے۔

ہفتہ وار اجتماعات کی ضرورت

یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ ہر انقلابی جماعت کے لئے اس طرح کے اجتماعات کا اہتمام کرنا ایک لازمی امر ہے۔ ہر انقلابی گروہ یا جماعت کا کوئی نہ کوئی لٹریچر ہوتا ہے جو اس کے اساسی افکار و نظریات پر مشتمل ہوتا ہے اور کسی بھی انقلابی گروہ یا جماعت کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اساسی لٹریچر کے ساتھ اپنے ذہنی ربط و تعلق کو برقرار رکھے اور اس لٹریچر کے ذریعے وقتاً فوقتاً اپنے افکار و نظریات کو تازہ کرتی رہے۔ مختلف جماعتیں اسی غرض سے ہفتہ وار اجتماعات کا اہتمام کیا کرتی ہیں۔ مسلمان بھی دراصل ایک نظریاتی گروہ کے افراد ہیں۔ اس گروہ یا اُمت کے سامنے ایک عظیم مشن ہے' فرائض رسالت کی ادائیگی کی ذمہ داری اسی اُمت کے کاندھوں پر آئی ہے' انقلاب نبویؐ کی عالمی سطح پر تکمیل اُمت کا مشن قرار پایا ہے اور اس انقلابی جماعت کا لٹریچر ہے قرآن مجید۔ ان کے فکر کو تازہ کرنے اور ان کے نقطۂ نظر کو صحیح رکھنے کے لئے اس ابدی لٹریچر کی پیہم اور مسلسل تعلیم کا نظام جاری کر دیا گیا خطبہ جمعہ کی شکل میں۔ اس خطبے کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ فرمایا گیا کہ جب امام خطبہ دے رہا ہو تو ایک دوسرے سے کلام نہ کرو' یہاں تک کہ دوران خطبہ اگر تم نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ خاموش رہو تو اتنا کہنا بھی ایک ناپسندیدہ حرکت ہے۔ ((اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ اَنْصِتْ فَقَدْ لَغَوْتَ)) کہ اگر کسی نے کوئی لغو حرکت کی کہ دوران خطبہ بولنا شروع کر دیا اور تم نے اس سے کہا کہ "چپ ہو جاؤ" تو تم نے بھی ایک لغو حرکت کا ارتکاب کیا۔ پوری خاموشی کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہو کر سنو۔ اللہ کے پاک کلام کی جو تعلیم و تلقین ہو رہی ہے اور اس کے ذریعے سے جو تذکیر و نصیحت کا عمل خطبے کی صورت میں جاری ہے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤ!

خطبہ جمعہ کی اہمیت کا اندازہ حضور ﷺ کے اس فرمان سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب خطبے کا آغاز ہو جاتا ہے تو وہ فرشتے کہ جو مسجد کے دروازوں پر بیٹھے آنے والوں کی حاضری کا اندراج کر رہے ہوتے ہیں' اپنے صحیفے اور رجسٹر بند کر دیتے ہیں اور وہ خود ہمہ تن خطبے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جمعہ میں صرف وہی لوگ حاضر شمار ہوتے ہیں جو وقت پر آئیں اور مکمل خطبے کی سماعت کریں۔ ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ اول تو وہ

خطبہ عربی زبان میں ہے اور ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ع زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم! ـــــ اس کی تلافی کے لئے اگر تقریروں اور وعظوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تو بڑے دکھ کے ساتھ یہ عرض کر رہا ہوں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان تقریروں میں اور سب کچھ ہوتا ہے سوائے قرآن کے! اس میں سیاست پر بات ہو گی، فرقہ واریت پر گرما گرم گفتگو ہو گی، اس میں کہانیاں ہوں گی، لطیفے بیان ہوں گے، نہیں ہو گا تو بس قرآن نہیں ہو گا جس کے لئے یہ سارا نظام تجویز کیا گیا! جس کے لئے یہ سارا کھکیڑ مول لیا گیا ہے!

یہ ہے حکمت و احکامِ جمعہ کا مضمون جو اس سورۂ مبارکہ میں بڑی جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ جمعہ سے متعلق احکام دوسرے رکوع میں وارد ہوئے اور اس کی حکمت کا بیان گویا پہلے رکوع میں ہو گیا کہ وہی نبوی عمل جس کا بیان چار اصطلاحات کی صورت میں ہوا ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ اس کو دوام اور تسلسل عطا کر دیا گیا خطبہ جمعہ کی شکل میں۔ بلاشبہ یہ تعلیم بالغاں کا ایک عظیم نظام ہے۔ چشم تصور سے دیکھئے آج اس گئے گزرے دَور میں بھی لاکھوں انسان جمعہ کے لئے بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آتے ہیں ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی"۔ افسوس کہ یہ عظیم عمارت فی الواقع اب کھنڈر بن چکی ہے۔ اس کی حکمت اور اس کی غرض و غایت ہمارے پیشِ نظر ہی نہیں رہی، جمعہ اب ہمارے ہاں بس ایک رسم بن کر رہ گیا ہے اور اس کو رسم کی حیثیت سے ادا کرنے والے آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن ہماری کوتاہی کے باعث اس سے وہ مقصود حاصل نہیں ہو رہا جو کہ اس مبارک عبادت سے حاصل ہونا چاہئے۔

احکامِ جمعہ ـــ بعض دیگر ہدایات

بہرکیف یہ ہے وہ ربط و تعلق جو دوسرے رکوع کی تین آیات کا اس سورۂ مبارکہ کے عمود کے ساتھ بنتا ہے۔ اس دوسرے رکوع میں بعض مضامین اور بھی ہیں جو اگرچہ سورۃ کے عمود اور ربط کلام کے اعتبار سے ضمنی قرار پائیں گے لیکن بہرحال ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ علم و حکمت کا ایک قیمتی موتی ہے۔ ایک تو خطبہ جمعہ کی خصوصی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ کہ لپکو اللہ کے ذکر کی طرف! ـــــ خیال رہے کہ نماز کے لئے دوڑ کر جانے سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے، یہ وقار کے منافی ہے۔ ورنہ یہاں لفظی

ترجمہ تو یہی ہو گا کہ دوڑو اللہ کی یاد کی طرف۔ لیکن ہم اس سے مراد لیں گے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہمہ تن متوجہ ہو جاؤ۔

اگلے الفاظ بھی نہایت قابل توجہ ہیں: ''وَذَرُوا الْبَيْعَ '' کاروبار ترک کردو! ''ذَرُوا'' امر کا صیغہ ہے اور یہ قاعدہ سب کے علم میں ہے کہ ''اَلْاَمْرُ لِلْوُجُوْبِ''۔ چنانچہ اذانِ جمعہ کے بعد کاروبارِ دُنیوی مطلقاً حرام ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ ذہن میں رہے کہ یہ حکم اصلاً اذانِ ثانی سے متعلق ہے' اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ایک ہی اذان ہوتی تھی۔ دوسری اذان کا اضافہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں کیا گیا جب مدینہ منورہ نے وسعت اختیار کرلی۔ لہٰذا اس حکم کا پوری شدت کے ساتھ اطلاق تو ہو گا اذانِ ثانی کے بعد' لیکن تبعاً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اذانِ اولیٰ کے بعد جمعہ کی تیاری کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو جانا اور مسجد کی طرف لپکنا اس آیت کے منشا میں شامل ہے۔

اس آیت میں لفظ ''ذکر'' بھی خصوصی طور پر لائق توجہ ہے۔ یہاں ذکر سے مراد ہے خطبہ جمعہ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' خطبہ دراصل قرآن کی تعلیم ہی کا ایک ذریعہ ہے۔ خطیب کا کام یہ ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے حوالے سے تذکیر کرے' وعظ و نصیحت کرے۔ اور قرآن مجید خود اپنے آپ کو بھی ''الذِّکر'' قرار دیتا ہے۔ سورۃ الحجر کی اس آیت میں بھی جو کثرت سے بیان کی جاتی ہے' قرآن کے لئے ''الذکر'' کا لفظ آیا ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ ﴾ (الحجر : ۹)

''یقیناً ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں''۔

امت مسلمہ کے لئے خصوصی سہولت

اس کے بعد فرمایا کہ جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ۔ ﴿ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ سابقہ امت میں یوم السبت (ہفتے کا دن) کُل کا کُل عبادت کے لئے مخصوص تھا اور اس میں کاروبارِ دنیوی مطلقاً حرام تھا۔ لیکن اُمت محمد ﷺ کے لئے اس معاملے میں آسانی پیدا کی گئی ہے اور وہ یہ کہ صرف اذانِ جمعہ سے لے کر اختتامِ نماز تک دُنیوی کاروبار اور تجارتی لین

دین کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اجازت دے دی گئی کہ جب نماز ادا ہو چکے تو اب تمہیں اختیار ہے کہ جاؤ اور تلاشِ معاش میں مصروف ہو جاؤ۔ اس ضمن میں جو الفاظ یہاں لائے گئے ہیں وہ نوٹ کرنے کے قابل ہیں۔ فرمایا ﴿ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ کہ جو کچھ تم کماؤ گے اسے اللہ کا فضل سمجھو' اسے اپنی محنت کا نتیجہ سمجھنا درست نہ ہو گا۔ محنت یقیناً تمہیں کرنی ہے' لیکن جو رزق اور روزی تمہیں عطا ہوئی ہے یہ اللہ کا فضل ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کا نقطۂ نظر یہی ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی تاکید فرمادی: ﴿ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ ﴾ کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی اللہ کا ذکر جاری رہنا چاہئے۔ اپنے تمام اوقات کو ذکرِ الٰہی سے آباد رکھنے کی کوشش کرو ـــــ "اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ دوامِ ذکر کی بڑی فضیلت ہے۔ "اِسْتِحْضَارُ اللّٰهِ فِي الْقَلْبِ" یعنی اللہ کی یاد کو دل میں تازہ رکھنا پسندیدہ ہی نہیں مطلوب بھی ہے۔ اور یہاں تو اسے فلاح کے لئے بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آخری آیات کے حوالے سے ذکر کے مفہوم پر کچھ باتیں قدرے تفصیل سے عرض کی جا چکی ہیں' ان کو ذہن میں تازہ کیجئے!

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت میں ایک متعین واقعے کے حوالے سے تنقید کر کے خطبہ جمعہ کی اہمیت کو مزید واضح کر دیا گیا کہ خطیب جب خطبہ دے رہا ہو تو اس حال میں اسے چھوڑ کر کسی تجارتی لین دین یا کسی دیگر مصروفیت کی جانب متوجہ ہو جانا نہایت نامناسب طرزِ عمل ہے' خواہ کسی اشد ضرورت کے تحت یہ معاملہ کیا گیا ہو۔ مختصراً یہ کہ سورۂ مبارکہ گویا گھوم رہی ہے اس مرکزی آیہ مبارکہ کے گرد: ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ اور یہی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا بنیادی طریق کار اور انقلابِ محمدیؐ کا اساسی منہاج!

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ' وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ○○

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـ اور ـ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ